ماہنامہ
سہیل
گیا
کے نام

بانی : حافظ محمد عبد الرحمٰن بسمل سنسہاروی

بیادگار : زین العابدین احمر وادریس سنسہاروی

ایک شمارہ : شاہد جمیل کے نام

ماہنامہ سہیل گیا

اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۸ء

چیف ایڈیٹر
مسعود منظر

ایڈیٹر
جمیل منظر

مرتب : سید احمد قادری

شمارہ ۱۰، ۱۱، ۱۲

جلد ۵۸

بدل اشتراک :
فی شمارہ : ۵ روپے
زر سالانہ : ۵۰ روپے
لائف ممبری : ۱۰۰۰ روپے

خط وکتابت وترسیل زر کا پتہ :
ماہنامہ 'سہیل'، ریورسائڈ روڈ، گیا - ۸۲۳۰۰۱

فون : ۴۳۶۵۸۴ ؛ ۴۲۱۵۷۳

اس شمارے کی قیمت ۲۵ روپے

فہرست

پرنٹر پبلشر این منظر نے لیبل آرٹ پریس پٹنہ ۴ سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ سہیل ریور سائڈ روڈ گیا سے شائع کیا

نمود

اقبال واعتراف

سہیل کا پیش نظر شمارہ اردو کے ایک خوش فکر شاعر شاہد جمیل کی تخلیقی صلاحیتوں کا مختصر اور سرسری اقبال و اعتراف ہے۔ شاہد جمیل سن و سال کے لحاظ سے اپنی تحویل میں طویل زمانی تجربہ نہیں رکھتے ہیں۔ انہوں نے گذشتہ تین دہائیوں میں شعری تخلیق کا جو سفر طے کیا ہے، اس پر حیرت ہو یا نہ ہو مسرت تو ضرور ہوتی ہے۔ اپنے معاصرین میں شاہد جمیل کا امتیاز یوں بھی بنتا ہے کہ انہوں نے مملکت شعر و ادب میں پروانۂ راہداری حاصل کرنے کے لیے کبھی ادبی ہنگاموں میں شرکت نہیں کی۔ کبھی نئے، جدید، جدید تر یا مابعد جدید جیسی تختیاں لے کر بہت سے معاصرین کے ساتھ جلوس میں شامل نہیں ہوئے۔ غالباً وہ سمجھتے ہیں کہ فن کار کو پہلے فن کار ہونا چاہیے۔ خانہ بندی اور فرقہ بندی اصل فن کار کا وطیرہ نہیں ہوتا۔ ان کی تخلیقات ملک اور بیرون ملک کے مقتدر ادبی جرائد میں شایع ہوتی رہتی ہیں اور شعر و ادب کے سنجیدہ قارئین اور معتبر اہل الرائے سے داد و تحسین حاصل کرتی رہی ہیں۔

ادارہ 'سہیل' جانتا ہے کہ شاہد جمیل کو تخلیقی سفر کی ابھی بہت سی منزلیں طے کرنی ہیں۔ دُور تک موجِ خرام سے ایسے نقوش پیدا کرنے ہیں جنہیں دیکھتے ہوئے ان کے معاصرین اور متقدمین اپنا سفر طے کر سکیں گے۔ لیکن تخلیقی جد و جہد کے روز اول سے آج تک ان کے حاصلات کا مطالعہ اس لحاظ سے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ ایک جینوئین فن کار کو یہ اندازہ ہو سکے کہ ادب و شعر کے نام پر ہونے والی ہر پیش رفت پر اردو کا سنجیدہ قاری خصوصی نظر رکھتا ہے اور یہ نہیں بھولتا کہ آج کے منظر نامے پر کون سا فن کار نمایاں نقوش بنا رہا ہے۔ اعتراف و اقبال کا یہ تحفہ شاہد جمیل کے لیے افتخار کی بات ہو یا نہ ہو کم سے کم اس سے اردو کی معاصر شاعری کی خواندگی اور زاویہ و تحسین کا اندازہ ضرور ہو سکتا ہے۔ اور اسی لیے مجھے توقع ہے کہ 'سہیل' کے قارئین اعترافات کے ایسے سلسلوں اور خاص طور پر پیش نظر شمارے کے بارے میں اپنی گرانقدر رائے ضرور دیں گے۔

— مسعود منظر —

ماہنامہ سُہیل گیا کا ایک اور کارنامہ

وہاب اشرفی نمبر

ایک یادگار دستاویز

تشکیل وترتیب کی منزلوں میں ہے

قلم کار حضرات جلد از جلد توجہ فرمائیں

اس شاندار اور دقیع خصوصی پیش کش کا ایک اجمالی خاکہ

- وہاب اشرفی کی کہانیوں، تنقیدی مقالات، کتابوں، ان پر لکھی گئی تحریروں کا مکمل ڈاٹا
- وہاب اشرفی کی مطبوعات پر لکھے گئے تبصروں کا انتخاب، مشاہیر اہل قلم کی ان تحریروں کے اقتباس جن میں وہاب اشرفی کا ذکر ہے، ان کی کتابوں کے پیش لفظ کے ضروری حوالہ جات واقتباسات۔
- وہاب اشرفی کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر قیمتی مقالات
- وہاب اشرفی کا ایک تفصیلی انٹرویو —— افسانوں اور تنقیدی مضامین کا انتخاب —— متعدد تصویریں —— بہترین گٹ اپ
- تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل ایک نہایت خوبصورت اور قابل مطالعہ مجلّہ

مشتہرین حضرات فائدہ اٹھائیں

ادب کے قارئین اپنی کاپیاں محفوظ کرالیں

پتہ: ماہنامہ سہیل، ریورسائڈ روڈ، گیا ۸۲۳۰۰۱، فون نمبر: ۲۱۵۷۳

عرضِ مرتّب

ماہنامہ "سہیل" گذشتہ ۵۸ برسوں سے لگاتار اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کا کام کر رہا ہے۔ اس طویل عرصے میں "سہیل" نے نجانے کتنے نشیب و فراز دیکھے، کتنے سنگلاخ راستوں سے اسے گزرنا پڑا۔ اس دوران مسعود منظر، ان کے والد ادریس سنہاروی اور ان کے والد بسمل سنہاروی کے حوصلے اور ہمت میں کبھی کمی نہیں آئی۔ اس ایک خاندان کی تین نسلوں نے جس حوصلے، جوانمردی اور خلوص و جذبہ کے تحت اردو زبان و ادب کی خدمات انجام دی ہیں، وہ یقینی طور پر ادبی تاریخ کا ایک حصہ بن گئی ہیں۔

"ماہنامہ "سہیل" نے مختلف اصناف کے ساتھ ساتھ مختلف اہم ادبی شخصیات پر خصوصی نمبر اور گوشے شائع کر کے انہیں دستاویزی حیثیت دی ہے۔ اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی اردو کے جواں سال شاعر شاہد جمیل کا یہ خصوصی مطالعہ ہے۔ شاہد جمیل نے اپنی بے پناہ شعری صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی انفرادیت کے ساتھ اردو ادب میں جگہ بنائی ہے۔ اس سے اس بات کا قیاس لگایا جا سکتا ہے کہ آج کا یہ شاہد جمیل آنے والے کل کا ایک بے حد معتبر، باوقار اور قابل قدر و قابل فخر شاعر ثابت ہوگا۔ ایک بڑا شاعر بننے کے لئے جن اوصاف کا ہونا ضروری ہوتا ہے، ان کی جھلک شاہد جمیل کی غزلوں، نظموں اور دیگر شعری اصناف میں نمایاں طور پر موجود ہے۔ شاہد جمیل کے افکار و اظہار، لب و لہجے کی تازگی و ندرت اور معنوی سحر کاری نے نقادوں اور قارئین کو چونکایا ہے اور اسی چونکنے کے عمل کا مثبت ردعمل "سہیل" کا یہ خصوصی شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ مختلف مضمون نگاروں نے شاہد جمیل کی شاعری کو مختلف انداز سے دیکھا اور پرکھا ہے اور اپنے اپنے طور پر ان کے سلسلے میں رائے قائم کی ہے۔ اس ضمن میں میں مرحوم کلام حیدری کے مضمون کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہوں گا۔ اس لئے کہ شاہد جمیل پر لکھا گیا ان کا مضمون ان کی زندگی کی آخری تحریر ہے۔ شاہد جمیل کا شعری مجموعہ "خوابوں کے ہمسائے" کی صوری و معنوی خصوصیات نے انہیں متاثر کیا تھا اور میری صرف ایک گذارش پر انہوں نے مضمون لکھ کر مجھے دے دیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ کلام حیدری مرحوم کے اسی مضمون کے حصول کے بعد ہی شاہد جمیل کے لئے خصوصی گوشہ کی تحریک مجھے ملی تھی ــــ اور اثبات و نفی کی کئی منزلوں سے گزرنے کے بعد یہ شمارہ تکمیل کے مرحلے تک پہنچا ــــ ڈاکٹر علیم اللہ حالی، مسعود منظر اور جمیل منظر کی ذاتی دلچسپی اور تعاون اگر مجھے نہ ملتا تو شاید یہ خصوصی مطالعہ شائع نہ ہو پاتا۔ آپ کو یہ خصوصی شمارہ کیسا لگا، آپ کی حتمی رائے کا ہمیں انتظار ہے۔

سید احمد قادری

انٹرویو

شاہد جمیل سے سیّد احمد قادری کی گفتگو

گذشتہ چند دھائیوں میں اپنی شاعری کے حوالے سے نئی نسل کے جن فنکاروں نے فکری اور فنی اعتبار سے اپنی نمایاں پہچان بنائی ھے ان میں شاھد جمیل کا نام سرِ فہرست ھے۔

شاھد جمیل کی غزلوں اور نظموں نے جہاں ایک طرف اُردو کے شعری ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ھے، وھیں دوسری جانب وہ "جدید اسلوب" جیسا معیاری اور خالص ادبی رسالہ نکال کر اردو ادب کی سمت و رفتار کو متعین کرنے میں اھم رول ادا کر رھے ھیں۔

ایسے متحرک باصلاحیت اور باوقار شاعر اور صحافی کی شخصیت کے افکار و نظریات کو جاننے اور سمجھنے کے لئے چند سوالات لے کر جب شاھد جمیل صاحب کی خدمت میں حاضر ھوا اور جوابات کے لئے ان سے گزارش کی تو وہ انکار نہیں کر سکے۔ پیش ھے قارئین "سہیل" کے لئے ایک مختصر ملاقات کے دوران ھوئی گفتگو کی تفصیل!

• سید احمد قادری

سید احمد قادری: وہ کون سے محرکات تھے، جن کی بناء پر آپ شاعری کی طرف مائل ہوئے؟

شاھد جمیل: (مسکراتے ہوئے) شاعری کے لئے محرکات! مشکل سوال کیا آپ نے۔ میرے خیال میں شاعری ہی تو ایسی چیز ہے جس کے لئے کسی محرک کی ضرورت شاید باید ثانوی ہوتی ہے۔ بالکل ذاتی ہوتا ہے یہ معاملہ اکثر۔ بس یوں سمجھئے، اندر سے کچھ پھوٹا! کوئی خیال! کوئی مصرع! اور طبیعت مائل ہوئی۔ یعنی وہ جو ایک ہیجانی کیفیت یا اضطراب کا عالم ہوتا ہے تو یہ سب شاعری کے لئے FACTORS ہو سکتے ہیں۔ پھر آمد کو لیجئے۔ یہ تو اصل جادو ہے۔ آمد ہو تو کئی کئی روز تک لکھتے رہیے۔ ہاں تراش خراش کا کام ہفتوں نمٹاتے رہیے۔ لیکن شاعری میں سارے کھیل تماشے آمد، آورد، موڈ اور کسی خیال یا جذبے کے شعوری لاشعوری آنکھ مچولی سے منسلک ہیں جس میں زمان و مکان کی کوئی قید نہیں۔ کبھی کبھی تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ فلاں شعر کا مضمون کیوں کر سوجھا؟ بہت چھوٹا تھا میں۔ شاید چھٹویں یا

ساتویں جماعت کا طالب علم۔ تب میں نے پہلی چیز لکھی تھی۔ اب لاکھ یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ ان اشعار کے پیچھے کون سے جذبات کارفرما تھے، کچھ یاد نہیں آتا (ہنس کر) بس یوں سمجھ لیجئے شاعر ہونا تھا، سو ہو گیا۔

قادری: تو گویا اس کے بعد آپ نے مستقلاً لکھنا شروع کر دیا۔ کلام پر اصلاح آپ کس سے لیتے تھے؟

شاھد جمیل: مستقل طور پر لکھنا تو ۱۹۶۹ء سے شروع ہوا یعنی اس پہلی تخلیق کے دو تین برسوں بعد۔ جہاں تک کلام پر اصلاح کی بات ہے تو اس سلسلے میں میں نے اُستاذی قبلہ محترم حضرت حشر سہسرامی مرحوم کو چار پانچ چیزیں دکھائی تھیں۔ قلم بھی انہوں نے لگایا تھا۔ لیکن یہ کہہ کر آئندہ کے لئے منع کر دیا کہ میاں تمہارے کلام پر اصلاح کی کوئی ضرورت نہیں۔

قادری: سہسرام آپ کا آبائی وطن ہے، جو علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ اس سے آپ کس حد تک متاثر ہوئے؟

شاھد جمیل: (مسکراتے ہوئے) بہت عمدہ سوال ہے بھائی میرے! سہسرام تو میرا MAKER ہے۔ میرا شہر سہسرام۔ میرے لڑکپن کا سہسرام! میرے ابتدائی دور کا، امیدوں، اُمنگوں اور تازگی بھرا سہسرام!! وہاں کی مٹی، وہاں کی ہوا، وہاں کی گلیاں، وہاں کا علمی و ادبی ماحول!' میرے اسکول کالج کے دوست یار، سب کے سب کس قدر ENCOURAGING اور INSPIRING تھے میرے لئے۔ وہ زمانہ ۷۱-۷۰ء کا تھا۔ مجھے اب بھی یاد ہے۔ اُن دنوں میں اپنے ننھیال ڈہری اون سون سے دسویں جماعت کی تعلیم ختم کر کے سہسرام آیا تھا جہاں میٹرک میں میرا داخلہ ہوا تھا۔ ڈہری چھوڑتے وقت میں بہت رویا تھا۔ مگر سہسرام آنے کے بعد مجھے لگا کہ جیسے ایک نیا آسمان میری آنکھوں کے سامنے پھیل گیا ہو۔ غزل نظم کے نام پر میرا کل اثاثہ تب تک چار چھ اوٹ پٹانگ قسم کی چیزیں تھیں۔ انھیں دنوں مجھ پر اپنے اسکول کی کاپیوں میں ہر روز ایک نظم لکھنے کی سنک سوار ہوئی۔ ایک روز میرے ایک کلاس فیلو توحید اعظم (آجکل سہسرام کا مشہور ایڈووکیٹ ہے) کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے مجھے ان چیزوں کو چھپوانے کی طرف میری توجہ مبذول کرائی۔ توحید نے مجھے سہسرام کی مشہور انصار لائبریری اور شیخ کرامت لائبریری کے نام سے آشنا کرایا اور بتایا کہ فلاں فلاں شاعر ادیب وہاں اُٹھتے بیٹھتے ہیں مجھے ان لوگوں سے ملنا چاہئے تاکہ ماحول مل سکے۔ پھر کیا تھا میرے اندر میرے باہر میں آپ کو بتاؤں جیسے ایک طلسم خانۂ حیرت کھل گیا۔ جیسے ایک چھپا ہوا دبستان نمودار ہو گیا ہو۔ میری شامیں بدل گئیں، گفتگو کا انداز کیا اٹھنا بیٹھنا سب کچھ ادبی ہو گیا...

قادری: مجھے بھی یاد ہے اُن دنوں آپ ایک بار اورنگ آباد آئے تھے تو آپ سے مختصر سا تعارف ہوا تھا۔ پہلی ہی جھلک میں آپ شاعر معلوم ہوئے تھے! (قہقہہ لگا کر) بہت دبلے پتلے تھے آپ!

شاھد جمیل: دُبلا پتلا! (قہقہہ) وہ تو اب بھی ہوں...... تو میں بتا رہا تھا کہ لائبریری کی شاموں نے مجھے جیسے بالکل ہی بدل کر رکھ دیا۔ مطالعے کا بھوت بھی سوار ہوا۔ دس دس گیارہ گیارہ بجے رات تک لائبریری میں اور لائبریری سے باہر نئے دوستوں کے ساتھ ادب اور شاعری پر نہ ختم ہونے والی گپ بازیوں کا سلسلہ چلتا۔ عمر تو کچھ تھی نہیں مگر غالب، اقبال اور فیض سے لے کر خلیل جبران، ابن صفی اور کرشن چندر تک ڈسکس ہوتے۔ میرے اسکول کے دوستوں میں جن کا ادبی ذوق اچھا خاصا تھا اُن میں توحید اعظم، ذوالفقار انور، آفاق عثمانی اور مظفر حسن عالی تھے۔ ان کے علاوہ کئی ادبی دوست بن گئے تھے جن میں محسن نظامی، ارمغان ساحل، عشرت علوی، پرویز عالم صدیقی، شمیم قاسمی، بدر رخ شیدائی اور عین تابش تھے۔ ان سب میں ارمغان ساحل، محسن نظامی اور شمیم قاسمی کو رسائل میں چھپنے چھپانے سے خوب شغف تھا، ادھر شہر کا ماحول یہ تھا آج یہاں مشاعرہ ہے تو کل وہاں کے لئے طرح دی گئی ہے۔ کہیں سے خبر آئی ہے کہ فلاں شاعر نے فلاں منظر پر درجن بھر اشعار کھڑے کھڑے کہہ ڈالے۔ کسی نے اطلاع دی کہ سلطان اختر

صاحب کی فلاں غزل نے ہنگامہ مچا رکھا ہے، کہیں بیسویں صدی' میں ظفر اقبال سہسرامی کی تازہ کہانی کے چرچے ہیں، کہیں شفق سہسرامی کی کہانی 'بزدل' کی 'عاشقی' موضوع بحث بنی ہوئی ہے۔ ادب' ادب اور ادب۔ سوتے جاگتے 'ادب' اوڑھنا بچھونا ادب، کلاس روم میں ہیں تو نظم لکھی جارہی ہے' کھانے پر بیٹھے ہیں تو غزل ہورہی ہے۔ غسل خانے میں ہیں تو شعر کہہ رہے ہیں۔ محرم کے جلوس میں آوارہ گردی ہورہی ہے تو اشعار اُتر رہے ہیں۔ کیا زمانہ تھا، کیا دور تھا۔ کیا ماحول تھا، کیا عمر تھی اور کیا طبیعت تھی۔ آمد ہی آمد۔ نزول ہی نزول' فی البدیہہ اشعار تو بارش کی بوندوں کی طرح برسا کرتے تھے۔ یوں سمجھئے تین چار برسوں میں ڈیڑھ دو کو سے زائد نظمیں، غزلیں اور کہانیاں وغیرہ لکھ ڈالیں۔ جن میں تقریباً سب ہی شائع ہوئیں۔ بچوں کے رسائل غنچہ بجنور، مسرت پٹنہ، ساقی لکھنؤ، نور رامپور اور پیام تعلیم دہلی کے علاوہ اور بھی کئی رسائل میں لگاتار میری تخلیقات شائع ہوئیں۔ علاوہ ازیں ادبی رسائل میں سہیل گیا، مورچہ گیا، آہنگ گیا، صبح نو پٹنہ اور آجکل دہلی وغیرہ وغیرہ دسیوں رسالے اخبارات اور ہفتہ واروں میں میں چھپتا رہا اور آج [خاموشی ـــ پھر مسکراہٹ] آج اگر چاہوں بھی تو نہ اُس رفتار سے لکھ سکتا ہوں اور نہ چھپ سکتا ہوں۔ تو یہ تھا میرا MAKER، میرا ENCOURAGER اور INSPIRER سہسرام!!

قادری: بہت خوب! اچھا یہ بتائیے کہ شاعری کو ہی آپ نے اظہار خیال کا وسیلہ کیوں بنایا؟

شاھد جمیل: ہاں یہ بات تو ہے مگر شروع شروع میں ایسا نہیں تھا۔ ۷۰ء سے ۸۰ء تک گاہے گاہے نثری چیزیں بھی لکھیں۔ یوں سمجھئے دو درجن سے زائد! ان میں سے دو کہانیاں سہیل میں' ایک 'شب خون' میں اور ایک 'اب' [ہندی] میں شائع ہوئی تھی۔ بچوں کے لئے لکھی گئی کہانیاں بھی چھپیں۔ بچوں کا ایک ناول ۷۲ء تا ۷۳ء 'غنچہ' بجنور میں ۲۲۔۲۳ قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ ویسے جہاں تک شاعری کو ہی اظہار خیال کا ذریعہ بنائے جانے کا سوال ہے تو میرے ساتھ ایسا ہے کہ کوئی موضوع، خیال یا مضمون تخلیق کی صورت میں ڈھلنے سے پہلے از خود شعر کے پیرائے میں ہی وارد ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کی صنف بھی! یعنی اشعار ہو رہے ہیں تو غزل ہو جاتی ہے۔ ایک خیال کی محویت قائم ہوئی تو پھر نظم لکھتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔ ویسے میں محسوس کرتا ہوں کہ شعر کے معاملے میں جس تیزی اور تیز رفتاری کے ساتھ میرا ذہن کام کرتا ہے' نثر میں ویسا نہیں ہوتا۔ شاعری میرے مزاج کے عین مطابق ہے۔ چنانچہ اسی کو چُنا اور خود کو اسی راستے پر لگایا۔

قادری: شاعری کے ساتھ ساتھ "جدید اسلوب" لے کر صحافت کے خارزار میدان میں بھی داخل ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ ادبی بددیانتی کا سدباب ہے یا کچھ اور؟

شاھد جمیل: پرچہ جاری کرنے کا خیال تو برسوں پرانا تھا' میرے اسکول کے ساتھی اور عزیز دوست مظفر حسن عالی نے ایک بار سنجیدگی سے اس طرف متوجہ کیا تو "جدید اسلوب" وجود میں آگیا۔ اس کے دو شمارے اب تک آئے ہیں لیکن اردو دنیا میں اس کا رسپانس بے حد امید افزا ہے۔ "جدید اسلوب" کے اجراء کا مقصد صرف ادبی بددیانتی کا اندھیرا دور کرنا ہی نہیں' اور بھی بہت کچھ ہے' ویسے اب سے ۲۵۔۲۰ سال قبل ہم لوگوں کے ابتدائی دور کے مقابلے میں دیکھا جائے تو آجکل رسالے زیادہ تعداد میں نکل رہے ہیں اور نئے لکھنے والے نسبتاً جلد شہرت پا رہے ہیں" جدید اسلوب" میں CREAM LITERATURE چھاپنے کے معاملے میں 'میں' اب بھی سنجیدہ ہوں۔ اس کا ایک مقصد جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے دوران اس نسل کو آگے لانا بھی ہے۔ جن کی تخلیقی شناخت کے لئے نہ تو کوئی رسالہ سنجیدہ ہے اور نہ نقاد۔ پیشہ ور لکھنے والے ہندوستان سے پاکستان تک جگالی سے باز نہیں آرہے ہیں اور جینوئین لوگوں کو مناسب RECOGNITION نہیں مل رہا ہے' ہر رسالے میں ہر چیز چھپ رہی ہے تو ایسے میں یہ ضروری

کہ کوئی رسالہ ایسا ہو جس کے نزدیک EVERYTHING FAIR نہیں ہو۔ بس دعا کرتے رہئے کہ میری بے طرح معروفیات مجھے اتنی فرصت ضرور دیتے کہ "جدید اسلوب" نکلتا رہے۔

قادری : کہا جاتا ہے کہ اردو کے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں پر صدر مقام کے لوگوں کا قبضہ رہتا ہے۔ چھوٹے شہروں اور قصبوں کے بڑے سے بڑے فنکار کو اس کا حق نہیں ملتا ہے اور انھیں ترجیح نہیں دی جاتی ہے! آپ کا کیا خیال ہے؟

شاھد جمیل : سولہ آنے سچ! اس افراتفری کے دور میں جب ہر ایک، دوسرے کے کاندھے پر پاؤں دھر کے اپنا علم بلند کرنے کی فکر میں ہے، بھلا دور دراز کے خاموش عبادت گزاروں کی بات کون سوچتا ہے۔ خواہ ان کا مرتبہ کچھ بھی ہو۔ اردو کا معاملہ اس لئے بھی گمبھیر ہے کہ اس کے نام پر قائم شدہ اداروں میں 'مقامی فرشتہ یا فتاؤں' کی حاضری زیادہ تر ہوتی رہتی ہے۔ نفسیاتی طور پر جو لوگ تعلق اور رابطے میں ہوتے ہیں اُن پر ہی نظر رہتی ہے۔ اس نکتے کو آپ، PUBLIC RELATIONING کی کامیابی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ بہر حال یہ ہر زمانے میں رہا ہے۔ کبھی کم کبھی زیادہ۔ UNDESERVINGS کو CONSIDER بھی اسی لئے کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے RECOMMENDERS کی ہر جائز و ناجائز پالیسی کو YES کر سکیں۔ ویسے اس قسم کے ادارے عموماً نیم سیاسی ہوتے ہیں اور جہاں سیاست ہے وہاں ایمانداری کا تصور ناقابل یقین ہے۔

قادری : اُردو زبان بنیادی سطح سے ختم ہوتی جارہی ہے اس کی وجوہات کیا ہیں اور اس کے ذمّے دار کون لوگ ہیں؟

شاھد جمیل : اردو کو کچھ نہیں ہونے والا۔ کوئی بھی زبان صرف بولنے والوں میں ہی نہیں بلکہ لکھنے، پڑھنے، سوچنے اور جینے والوں میں بھی زندہ رہتی ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ آج کی تاریخ میں حالات بہت امید افزا نہیں۔ اصل مسئلہ گلوبلائزیشن سے اُبھرا ہے۔ پوری دنیا GLOBAL MARKET ہونے جارہی ہے بازار قیمت کی تیزی سے دخل اندازی کے اس عہد میں بین الاقوامی زبانوں کی اہمیت بڑھ رہی ہے جو الکٹرانک میڈیا پر حاوی ہیں۔ ایسے میں ہندی بھی انگلش کے ساتھ مل کر "ہنگلش" بنی جارہی ہے ویسے اردو کا معاملہ تھوڑا الگ ہے۔ اس کی اپنی ایک IDENTITY ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ آپ کو یاد ہوگا ۳۰، ۲۹ سال پہلے اردو اسکرپٹ میں تبدیلی کے لئے کیا کیا سازشیں نہ ہوئیں، کبھی اسے صرف مسلمانوں کی زبان قرار دیا گیا، کبھی بیرونی حملہ آوروں کی زبان کہا گیا۔ تو اردو تو خود اپنی جنم بھومی ہندوستان میں ہی اپنے نام نہاد ہمدردوں کے ریکیٹ پر شٹل کاک کی طرح پچھلے پچاس برسوں سے وعدے جھیل رہی ہے۔ آج آپ جغرافیائی اعتبار سے دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ بہار، یوپی، دہلی اور پنجاب میں اردو جاننے والوں کی تعداد بے شک کم ہوئی ہے لیکن بولنے سمجھنے اور اسے پسند کرنے والے پورے ہندوستان میں ہیں۔ اس صورت حال کو مایوس کن تو نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں اردو کو اگر روزی روٹی سے جوڑ دیا جاتا تو اس کے فروغ کے لئے اکیڈمیوں اور اردو اداروں کی جانب حسرت بھری نگاہ سے نہ دیکھنا پڑتا۔ ویسے ہمارے بہار میں اسے دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے مگر سرکاری دفاتر میں تحریری اردو کس حد تک جاری و ساری ہے یہ سب کو معلوم ہے۔ ویسے مجموعی طور پر اردو کا مستقبل اندھیرے میں ہر گز نہیں ہے کیوں کہ آج اردو چاہے دنیا کے جس خطے میں بھی ہے اپنی تخلیقی، تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا پرچم پورے گلوب پر لہراتی نظر آتی ہے۔

قادری : مابعد جدیدیت سے متعلق نارنگ اور فاروقی جیسے دو اہم ناقدین ادب کے نظریات اور افکار میں کافی تضاد ہے۔ آپ کے خیال میں کس کا نظریہ صحیح ہے۔؟

شاھد جمیل : مابعد جدیدیت پر باتیں رسائل وغیرہ میں شروع ہو چکی ہیں۔ لیکن ہمارا ذہین ترین قاری بھی ابھی اس کے بارے میں شاید بہت کچھ نہیں جانتا (ہنستے ہوئے) قاری تو جدیدیت سے ہی رسّی تڑا کر بھاگا تھا اور اب یہ مابعد جدیدیت ——

مابعد جدیدیت جیسا کہ نام سے ظاہر ہے جدیدیت کے بعد کا تخلیقی دور ابھر رہا ہے۔ جس میں ذات کے کرب و انتشار کی بجائے معاشرہ، تہذیب، ثقافت اور جڑوں کی تلاش کا احساس زیادہ شدت سے ابھرا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ مابعد جدیدیت کے تعلق سے زیادہ سنجیدہ ہیں۔ انھوں نے مارچ ۱۹۹۷ء میں ایک سہ روزہ قومی سمینار اس موضوع پہ دہلی اردو اکادمی کے زیر اہتمام کرایا تھا جو اچھا خاصا تھا۔ میں بھی اس میں مدعو تھا۔ اس سمینار میں مابعد جدید نظم / غزل / ناول / افسانہ / تنقید وغیرہ پر پرچے پڑھے گئے تھے۔ بحث و مباحثے بھی ہوئے۔ لیکن ابھی کئی سطحوں پر یہ طے ہونا باقی ہے کہ مابعد جدید تخلیق کے خواص و نشانات حتمی طور پر کیا ہونے چاہئیں۔ اور یہ کہ اردو میں اس کی موجودگی کس قسم کے تخلیقی رویے سے نمو پذیر ہوتی ہے۔ مابعد جدید ادب اردو میں کب سے لکھا جا رہا ہے۔ کون کون سے شاعر ادیب اس کے مقتدر لکھاریوں میں شمار ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

گو یا سوالات بہر حال ہیں جن پر مزید سمینار کرانے کی ضرورت ہے اور رسائل میں مذاکرے مباحثے اور مضامین آنے چاہئیں تاکہ دھندلاہٹیں صاف ہو سکیں۔ جہاں تک شمس الرحمن فاروقی صاحب کا سوال ہے تو اُن کے نزدیک مابعد جدیدیت کا وجود مغرب میں بھی مشتبہ ہے سو اُردو ادب میں اس کا ذکر چہ معنی دارد؟ ان کا ماننا ہے کہ اردو میں مابعد جدیدیت کی ادبی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ میرا خیال ہے یہ بھی ایک طرح کی انتہا پسندی ہی ہے۔ ایک مضمون میں انھوں نے لکھا ہے کہ جب ادبی تخلیق کے اصول اور طریقے وہی ہیں جو جدیدیت کے زمانے میں متعین ہوئے تھے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ جدیدیت رخصت ہو چکی ہے۔ ایسا سوچنا صحیح ہے مگر صرف اصول اور طریقے بدلے نہیں تو کیا ہوا۔ اصل چیز ہے معاشرہ کی صورت حال اور IDEOLOGY میں تبدیلی۔ جس سے کوئی بھی تخلیق کار کم از کم لاشعوری طور پر لاتعلق نہیں ہو سکتا۔ تخلیق کار اپنے آپ میں بے حد ذاتی اور INTROVERT ہو سکتا ہے مگر اس کے انسلاکات اور ترجیحات کا تعلق بہر حال خارج سے ہوتا ہے اور خارج کا مطلب ہوتا ہے معاشرہ، تہذیب اور ثقافت اور تمام تر زمانی و مکانی وابستگیاں! اور شاعر ادیب بہر حال معاشرے میں تو رہتے ہی ہیں۔

قادری: تو آپ حالیہ ادب میں مابعد جدید رجحانات کی موجودگی تسلیم کرتے ہیں؟

شاھد جمیل: موجودگی یا غیر موجودگی کا پتہ لگانا نقادوں کا کام ہے میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نظم کی تخلیق کے اصول اور طریقے یا لفظیات وغیرہ جدیدیت کے زمانے سے الگ نہیں تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ نظم "جدیدیت والی ہی نظم" ہے۔ آپ فیض کو دیکھیں "گلشن" اور "قفس" جیسے انتہائی فرسودہ الفاظ کو کس طرح روایت سے نکال کر PROGRESSIVE POETRY کا اعلیٰ نمونہ بنا دیا۔ تو بڑا اور اعلیٰ تخلیق کار یہی کرتا ہے کہ کلیشے کو استعمال کرنے کے باوجود اسے کلیشے نہیں رہنے دیتا۔ لیکن کب کوئی تخلیق اثرات زمانہ کے شعوری لاشعوری انجذاب سے گزر کر نئے رجحان کی نمائندہ تخلیق بن جاتی ہے، یہ طے کرنا تنقید کا کام ہے اور ہماری تنقید نے ابھی یہی دریافت نہیں کیا کہ اردو میں مابعد جدید تخلیق کے نشانات ہیں کیا؟ ڈاکٹر وزیر آغا کے مطابق اردو میں کچھ چیزیں مابعد جدید رجحانات کے تحت ضرور لکھی گئی ہیں۔ مگر وہ سب شعوری کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ میرا خیال ہے تخلیقی اعتبار سے ابھی مابعد جدیدیت پردے کے پیچھے کھڑی ہوئی ہے۔

قادری: عصر حاضر میں ادب سے سیاست کے رشتے کو آپ کن معنوں میں لیتے ہیں؟

شاھد جمیل: واہ! لاکھ روپے کا سوال کیا ہے آپ نے! مگر اس کا جواب دوٹوک دینا ممکن نہیں۔ ویسے میری ذاتی رائے ہے کہ ادیب و شاعر کو سیاست و ریاست سے دور ہی رہنا چاہئے ادب ایمانداری، اخلاص اور سچائی کا روبار ہے۔ کھری اور سچی تخلیق ہی ہمیشہ زندہ ادب کا ضامن بنتا ہے۔ اب آپ سیاست وغیرہ اس میں ملائیں گے تو اس میں ایمانداری، کھرا پن اور سچائی کہاں سے لائیں گے۔

(ہنستے ہوئے) پھر اگر سیاست ہمارے ملک کی ہو تو اس کا تقریباً ننانوے فی صد کرمنلائزیشن ہو چکا ہے۔ پھر ہمارا ادب کیسے بچے گا؟ ویسے ادب کے کرمنلائزیشن کا دور ابھی نہیں آیا۔ البتہ ان کے POLITICALISATION میں لوگوں نے ذاتی مفاد کے امکانات ضرور ڈھونڈے ہیں اور اسکے ENCASHMENT میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ ویسے اگر کوئی شاعر لیڈر بن جائے تو اس سے شاعری کی موت تقریباً یقینی ہو جاتی ہے۔ البتہ کوئی لیڈر لیڈری چھوڑ کر قلم پکڑ لے تو اسے ادب میں ادب کم 'صحافت زیادہ ہوگی۔ کیوں کہ جینوئن رائٹنگ تو ودیعت ہوتی ہے' ویسے یہ غور طلب ہے کہ دنیا کے تقریباً ہر ملک کے شہکار ادب پر آپ جب نظر ڈالیں گے تو وہاں کے زندۂ جاوید فن پارے زیادہ تر وہی ملیں گے' جن میں زمان و مکان کے اعتبار سے بے حد وسیع و عریض سیاسی منظر نامے سانس لیتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ ہمارے ہاں فکشن میں عبداللہ حسین کی 'اداس نسلیں'، 'قرۃ العین حیدر کی 'آگ کا دریا' اور ہندی میں بھگوتی چرن ورما کی "بھولے بسرے چتر" اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ اس سے ادب اور سیاست کے گہرے اور معروضی رشتے کی وضاحت ہوتی ہے۔ گو سیاست بڑے اور زندہ ادب کے لئے SUPER MATTER کا کام ضرور کر سکتی ہے مگر خود ادیب کے ساتھ اس کا اتصال ادب کو POLLUTION ہی دے سکتا ہے۔

قادری: کیا صحیح ہے کہ آج کا اردو ادیب اور شاعر احساس کمتری کا شکار ہے۔ اس کی وجوہات کیا ہو سکتی ہیں؟

شاہد جمیل: مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔ بھلا احساس کمتری کن باتوں کو لے کر ہو سکتی ہے۔ اگر آپ نے اردو زبان کو اس کے جاننے والوں کی تعداد کو سامنے رکھ کر یہ سوال کیا ہے تو بھی میرا جواب نفی میں ہوگا۔ کم از کم شاعری کی حد تک تو بالکل نہیں۔ مانا کہ آج اردو شاعر کے بال بچے تک اردو اسکرپٹ سے نابلد ہو رہے ہیں۔ لیکن جس دھج سے اردو غزلیں ریڈیو، ٹی وی، فلموں اور شاعروں نیز غزل سنگروں کے ذریعے مقبولیت حاصل کر رہی ہیں اس سے تو نہیں لگتا کہ اردو شاعر کو کوئی احساس کمتری ہونی چاہئے۔ ہاں یہ خطرہ ضرور ہے کہ اردو شاعری کا مطلب ہی لوگ صرف غزل سمجھ بیٹھیں۔ میں خود ایک دفعہ ایک مشاعرے میں اپنی نظم سنا چکا تو لوگوں نے بڑے زور سے ہانک لگائی "غزل بھی۔ غزل بھی"۔ یہ خطرناک بات ہے۔ غیر اردو داں طبقہ اگر غزل کو اردو شاعری کا جزو کل سمجھ رہا ہے تو اس میں مشاعرہ چھاپ 'گلے بازوں' کا قصور اتنا ہی ہے جتنا 'بکی غزل لکھنے والے ڈیکیٹ مارکہ غزل نویسوں کا ___ رہی بات فکشن کی تو ہمارا فکشن رائٹر کس بات میں پیچھے ہے' چند سال قبل قرۃ العین حیدر کو ہندوستانی ادب کا اہم ترین ایوارڈ گیان پیٹھ دیا گیا۔ کتھا ایوارڈ والے حالیہ چند برسوں میں اردو کے بالکل تازہ اور ۷۰ء کے بعد کے کئی افسانہ نگاروں کو یہ ایوارڈ دے کر RECOGNISE کر چکے ہیں۔ یہ ایوارڈ بھی ہندوستان کی تمام زبانوں کی بہترین کہانیوں میں سے ایک پر ہر سال دیا جاتا ہے۔ 'شعر شور انگیز' جیسی انتہائی پرمغز اور تنقیدی کتاب کے لئے 'شمس الرحمٰن فاروقی کو برصغیر کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ "سرسوتی سمان" پچھلے سال دیا گیا۔ جو ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ ناقد بھی اردو کا اور تصنیف بھی اردو کے شاعر [میر] سے متعلق۔ کیا یہ بڑی بات نہیں؟ تو اردو کے شاعر ادیب کہاں اور کب کس سے پیچھے چل رہے ہیں۔ ادبی رسائل و جرائد کی اشاعت کو دیکھئے تو ان کی تعداد بھی کچھ کم نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان کی READABILITY ضرور متاثر ہوئی ہے۔ اور وہ بھی اس لئے کہ جدیدیت کے نام پر ہمارے ہاں خصوصاً نثری نظموں اور مختصر کہانیوں میں جو بے سمت اور بے جہت تماشے ہوئے ان سے خوفزدہ ہو کر قاری نے ڈائجسٹوں اور THRILLERS میں پناہ لی تھی۔ مگر آج قاری واپس آرہا ہے۔ اور ہمیں پڑھ کر اسے گلے لگاتا ہے۔

قادری: اور اب آخری سوال۔ شاعری میں آپ کن شاعروں سے متاثر رہے ہیں؟

شاہد جمیل: غالب کا کون شیدا نہیں! فیض نے بھی مجھے بے حد

ناصر کاظمی تو روح تک میں FASCINATE کیا ہے۔
اتر جاتے ہیں۔ بعد کے لوگوں میں مظہر امام کی غزل کی تہذیب اور
فضیل جعفری کی غزل کا وقار مجھے بے حد ENCHANTED
کرتا ہے۔ نظموں میں اختر الایمان اور ساقی فاروقی کو بیک وقت
پسند کرتا ہوں۔ ساقی کی لفظیات اور اسالیب پر تو عش عش
کرتا ہوں اور انھیں پوری نظمیہ شاعری میں لہجے کی کاٹ اور دھار
کے معاملے میں بالکل الگ تھلگ اور لاثانی تصور کرتا ہوں۔ ایک
اور اہم نام لوں گا جس کی نظم اور غزل یکساں طور پر مجھ پر جادو کرتی
ہے۔ جس کے شعر کی سچائی، بڑی اور زندہ شاعری کے تمام عناصر
کے ساتھ مجھے دیوانگی کی حد تک جھنجھوڑتی ہے —— اور
وہ ہیں ندا فاضلی صاحب!

قادری: آپ کا بہت بہت شکریہ!
شاہد جمیل: آپ کا بھی شکریہ!! ●

بقیہ: شاہد جمیل

آثار اچھے ہیں۔ کوئی وجہ مایوس ہونے کی نہیں ہے۔ بلکہ "خوابوں کے ہم سائے"
میں جا بجا ایسی چنگاریاں ملتی ہیں جو اہم روشنیاں بن سکتی ہیں۔
اردو اگر اس ہندوستان جنت نشان میں رہ گئی تو اردو کے آنے
والے شعرا اور شاہد جمیل کی طرح جواں سال شاعر "اپنے عہد بیمار" کو
مسیحائی کی کرامت دکھا سکیں گے ورنہ برج بانو تو مہاجر ہو چکی ہے۔ ●

بقیہ: شاہد جمیل: خوابوں کا شاعر

شاہد جمیل کی شاعری شاہد ہے، تجربے اور طریق اظہار
کی دلآویز اور گوناگوں کیفیات کی شاعری ہے"
("خوابوں کے ہم سائے" کے فلیپ پر)
شاہد جمیل عصر حاضر کا ایک نمائندہ شاعر ہے، جس کی آواز
اور افکار منفرد ہیں، جس کی سوچ اور خیالات کی پرواز آنے والے کل کا
اشاریہ ہے۔ ●

کلام حیدری (مرحوم)

شاہد جمیل

جنوں کی باگ سنبھالے ہوئے یہ فرزانہ شاعری کی دنیا کا پیارا پیارا سا فرد ہے، شاعری کو اس نے گلے لگایا اور شاعری نے اسے گلے لگایا۔ اس نے شاعری کو دینا چاہا اور دیا بھی تو شاعری نے بھی خود سپردگی کا کھل کر اظہار کیا۔ اس "دونوں طرف لگی ہوئی برابر کی آگ" نے "خوابوں کے ہم سایے" میں اپنے بے شمار جلوے دکھلائے ہیں۔ نقاب کے اندر نقاب کے باہر۔ سیال خواب، پڑے ہوئے خواب، منتشر خواب، خواب در خواب ــــ

دنیا کبھی دانشوروں، شاعروں، ادیبوں اور مفکروں کے لیے قابل تعریف جگہ نہیں رہی۔ کوئی بھی زمانہ ہو، مردود ہی ٹھہرایا گیا ہے۔ آدم سے جو گناہ سرزد ہوا تھا۔ اس کی سزا خدا نے یہ تجویز کی کہ آدم کو دنیا میں بھیج دیا جائے، سو یہ دنیا تو سزا کاٹنے کی جگہ ہے۔ اسے اچھا دیکھنے اور بنانے کی تمام کوششوں کے باوجود یہ اچھی نہ بن سکی۔ ہابیل قابیل ہی کے زمانے میں "قتل اول" ہوا اور پھر ایک سلسلہ ہے قتل و غارتگری کا۔ خلفائے راشدین چار ہوئے۔ تین کو خود امتِ رسولؐ کے ہی افراد نے شہید کر دیا۔ دن میں کم از کم پانچ بار نماز پڑھنے والے رسولؐ اور آلِ رسولؐ پر درود بھیجتے ہیں اور درود بھیجنے کے ثواب سے بھی واقف ہیں، مگر رسولؐ کے نواسے اور آلِ رسولؐ کو کربلا میں شہید بھی کرتے ہیں۔ عقل حیران ہے، آدمیت پریشان ہے، تقدس سر بہ گریباں ہے۔

وقت کا دریا ہے کہ بہتا چلا جا رہا ہے۔ ذات اپنی گہرائیوں میں ملعون زمانوں کی یاد محفوظ رکھے ہوا ہے۔ زمانوں کو ناپنے کے لیے آدمی نے سال، مہینہ، دن، گھنٹہ، منٹ، سکنڈ ــــ سب بنائے مگر زمانہ ان سب کی گرفت سے چھوٹ چھوٹ جاتا ہے ــ!

شاہد جمیل کے زمانے کے لیے ان کے نقادوں نے لفظ "بیمار" استعمال کیا ہے۔ ان کے زمانے کو "بیمار" عہد کہا ہے۔ خود نقاد بھی اور میں ایک قاری بھی "اسی عہد بیمار میں جی رہا ہے اور وہی سب دیکھ رہا ہے، سن رہا ہے، محسوس کر رہا ہے۔ مگر ایک شاعر جسے خدا "دلِ گداز" اور "چشمِ وا" بخشتا ہے، شاعری کو جزوِ پیغمبری بنا دیتا ہے۔ کیوں کہ خدا اسے اظہار پر قدرت بھی تو دیتا ہے۔ خدا سے زیادہ کون جان سکتا ہے کہ کس کا کتنا ظرف ہے۔ اس لیے مختلف شاعروں اور فنکاروں کو اپنے فن پر دسترس اور قدرت ان کے ظرف کے مطابق ہی دیتا ہے۔

"خوابوں کے ہم سایے" کے شاعر کو خدا نے اظہار پر اچھی قدرت دی ہے۔ بیس سال کے سرمایۂ شاعری کا یہ مجموعۂ کلام انتخاب شدہ صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اس میں نظمیں ہیں، غزلیں ہیں، متفرق اشعار ہیں۔

نظمیں : ۵۸

غزلیں : ۹۵

اور پھر صفحہ ۱۸۵ سے صفحہ ۱۹۰ تک اشعار ہیں۔ صفحہ ۱۹۳ سے آخری صفحہ ۲۲۰ تک غزلیں اور نظمیں ہیں۔ صفحہ ۱۹۳ سے صفحہ ۲۲۰ تک کی نظمیں اور غزلیں الگ کر کے شایع کی گئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعر کے بھائی کے انتقال نے شاعر کو اتنا ملال دیا کہ عرصے تک انہوں نے بہت ساری نظمیں بھائی کی یاد میں لکھیں ــــ ان نظموں اور غزلوں میں جذبات کی شدت بہت ہے۔

تیرے نام سے جو خط لکھوں

اپنے پتے پر پوسٹ کروں

میرے نام تری سب یادیں
درپن کی آنکھوں سے ٹپکیں
میرے کمرے کے دن رات
بارہ مہینے کی برسات

کیا عجب ہے
جب تلک تھا ساتھ میرے تو
مجھے وقتاً فوقتاً یاد آتا تھا
خدا جانے، خدا کے ساتھ جب سے تو ہوا ہے
کوئی لمحہ مرا تیرے تصور سے نہیں خالی

ایسا نہ تھا کہ ہر گھڑی سوچا کروں تجھے
اب تو نہیں تو چار سو دیکھا کروں تجھے

صـ۲۱۱ سے صـ۲۱۹ سرخ، سبز، زرد، سنہرا، گلابی، سرمئی اور سیاہ رنگوں کو غزل میں اس طرح استعمال کیا ہے:

سرمئی جسم، جاں سرمئی
درد کے سب جہاں سرمئی

جھنور میں قوس قزح
ہر ایک ساحل سیاہ

غم کو دونوں معتبر
سرخ دل کہ داغ سرخ

دل کا کھنڈر زرد زرد
یاد کی محراب سبز

میں اک رات ہر رات بے خواب
تو اک خواب ہر دم سنہرا

میں دل کی دھند پہ الحاد لکھ دوں
گلابی شب کا ہر مذہب گلابی

تو ازل ہے یا ابد یا کچھ نہیں
آسماں! سب تیرے منظر نیلگوں

سفید خواب، خواب کی سحر سفید
دھنک ہوئی سیاہ بحر و بر سفید

شاہد جمیل نے انگریزی کے ہر مہینے پر اشعار کہے ہیں۔ صـ۱۷۳ سے صـ۱۸۴ تک جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر پر پانچ پانچ اشعار کی نظمیں — یا مسلسل غزل کہہ لیجئے درج ہیں۔

خود کلامی شاہد جمیل کے یہاں ہے مگر یہ ہر جگہ جاری و ساری نہیں۔ مگر ہر جگہ اس کے جاری و ساری نہ رہنے سے شاعر کے اعتبار سے ان کا اپنا جو مرتبہ ہے وہ گرتا نہیں ہے۔ ۲۲۰ صفحات کے شعری مجموعے میں شاعری کے اتنے متفرق نمونے ہیں کہ جب تک پوری محنت کے ساتھ یہ تلاش نہ کیا جائے کہ شاہد جمیل کا مزاج کیا ہے تب تک شاعر کے سلسلے میں سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری میں روایات کا احترام ہے۔ کلاسک مزاج کا ان کی شاعری پہ سایہ کے ساتھ ساتھ نئی راہ نکالنے کی کوشش میں "عصرِ حاضر" موجود ہے۔

کائنات کے مختلف اجزا کی ہم آہنگی، ان کا تصورِ شکست و ریخت — ان کا پتہ شاہد جمیل کے یہاں ملتا ہے۔

جیسے جیسے وقت گزرے گا، ان کی دانشوری پختہ ہوگی۔ اظہار پر اور بھی قدرت بڑھے گی اس سے ان کی شاعری زیادہ قابل قدر اور قابل توجہ ہوگی۔ شرط صرف یہ ہے کہ ماضی اور حال کے ساتھ ماورائے عصر میں کچھ ہو جائے۔

(بقیہ صـ۱۳۵ پر)

علیم اللہ حالی
وہائٹ ہاؤس کمپاؤنڈ، گیا

شاہد جمیل کا فنکارانہ تشخص

شاہد جمیل کی نظمیں مجھے اچھی لگتی ہیں۔ اگر آپ وجہ پوچھیں تو شاید میں تفصیل کے ساتھ کوئی جواب نہ دے سکوں۔ کبھی سوچتا ہوں کہ یہ میری کون سی مجبوری ہے۔ کیا مجھے اظہار و بیان پر اتنی قدرت نہیں کہ میں اپنی پسند و ناپسند کی ترسیل کر سکوں، پھر خیال آتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ شاعری (بلکہ فنونِ لطیفہ) قدرت کی جملہ نعمتوں کی طرح تجزیہ و محاسبہ سے ماورا ہوتی ہے۔ اس کا حساب کتاب نہیں ہو سکتا۔ قوسِ قزح کے چند رنگوں کا نام تو بتایا جا سکتا ہے مگر مختلف رنگوں کے امتزاج سے پیدا ہونے والی بوقلمونی کا تجزیہ کیوں کر کیا جا سکتا ہے۔ تختۂ گل کی رنگا رنگی ہمیں جو نظارۂ جمال بخشتی ہے اس کا تخمینہ کیوں کر ہو سکتا ہے، مشامِ جاں کو معطر کرنے والی خوشبوؤں کی کیفیات ہم کیوں کر بیان کر سکتے ہیں۔ فطرت میں پھیلے ہوئے حُسن سے لطف اندوز تو ہو لیتے ہیں، مگر اس لطف کا مکمل بیان پیش کرنا ناممکن ہے۔ غم و انبساط کی صدہا لہروں سے ہم متاثر تو ہوتے ہیں لیکن ان کی صحیح توجیہہ سے ہم معذور ہوتے ہیں۔ دراصل ہمارے نطق و الفاظ آج بھی کم مایہ ہیں۔ یہ میری ذاتی مجبوری بھی ہے اور انسانی برادری کا اجتماعی عجز بھی ہے۔ فنونِ لطیفہ کے صحیح APPRECIATION میں ہمارا یہی عجز مانع بن جاتا ہے اور ہمیں نیم گفتنی بلکہ ناگفتنی پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

شاہد جمیل کی شاعری کے حوالے سے اظہار و بیان کی اس شست گاہی کا مسئلہ اس لئے بھی سامنے آتا ہے کہ ان کی شاعری حد درجہ PERSONAL ہے۔ یوں تو ہر شاعری بالعموم فنکار کی نجی اور ذاتی کیفیات اور اس کے اظہارات سے تعلق رکھتی ہے لیکن جب میں شاہد جمیل کی شاعری کو حد درجہ PERSONAL کہتا ہوں تو میری مُراد یہ ہے کہ یہ ان کی ان ذہنی کیفیات کی آئینہ دار ہے جن میں دوسروں کی شرکت اتفاقی ہی ہو سکتی ہے۔ اقبال، جوش، فراق، مجاز، فیض، پرویز شاہدی اور دوسرے بڑے شعراء نیز بعد والے درجات کے بے شمار شعراء کی فنکاری کا بڑا حصہ ایسے SUBSTANTIVE THOUGHTS پر مبنی ہے جس میں بہت سے قارئین کی شرکت ممکن ہے۔ شاہد جمیل کے یہاں موضوعات محسوسات کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں۔ اتنے لطیف اور مابعد الطبیعات (اس سے مراد الٰہیات نہ لی جائے) ہیں کہ انہیں ہم مٹھیوں میں جکڑ تو لیتے ہیں مگر پھر کھول کر دیکھتے ہیں تو سب کچھ ہوا ہو جاتا ہے۔ اسی سحر کا نام شاعری ہے اور یہی آگے بڑھ کر اعجاز کی منزلوں تک پہنچ جاتا ہے۔

شاہد جمیل کے تخلیقی منظر نامے پر نیم خوابیدگی کی فضا چھائی ہوئی ہے، ایک دھند ہے جو ہر طرف حاوی ہے۔ نیم خوابیدگی بصری و سماعی بے یقینی کا عالم پیدا کرتی ہے اور نہیں کے بیچ دیکھنے اور نہ دیکھ سکنے کی کشاکش، بشیری و نذیری کی یکجائی، سہمی سہمی سی ایک کیفیت، وقت کے ٹھہر جانے کا احساس اور اسی طرح کے دوسرے امتیازی اوصاف کے ساتھ شاہد جمیل کی شاعری ہمیں چونکاتی ہے، ہمیں اپنے پاس بلاتی ہے۔ ان کے تخلیقی و ذہنی رویے میں یاد، آسیب، خواب، دھواں، سایہ،

دھند، سمندر، سناٹا، خود کلامی، خوف، خالی پن، گونگی خواہش، سفر، ہمسائے، لمحوں کی جاودانی، خلا، ہیبت ناکی، روشنی اور موسم وغیرہ الفاظ و کیفیات کلیدی اشارات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ بنیادی محرکات بھی ہیں اور ان سے ان کی نظموں کا ڈھانچہ بھی بنتا ہے۔ عہد و عصر کا تسلسل شاہد جمیل کے فکر کا ایک منفرد جزو ہے۔ ان کے یہاں ماضی کبھی رخصت نہیں ہوتا، وہ اپنی ہئیت بدل کر موجود رہتا ہے اور اسی لئے سارے جذبے جاوداں ہوتے ہیں، کوئی شے مرتی نہیں، کوئی تعلق فنا نہیں ہوتا۔ سب کے سب نئی شکلوں کے ساتھ سامنے رہتے ہیں۔ رفاقت یاد بن جاتی ہے، خواب آسیب کا ہیولا اختیار کر لیتے ہیں، گفتگو خود کلامی بن جاتی ہے، خواہشیں سائے کی طرح ہو جاتی ہیں، سناٹا شور بننے لگتا ہے، ذاتی زندگی کی محرومیاں HALLUCINATION کا روپ دھار لیتی ہیں اس لئے ان کے یہاں گزیدہ لمحے تخلیقی تحرک کا باعث بن جاتے ہیں۔ حساس اور بے حد حساس انسان کے ساتھ مشکل یہ ہوتی ہے کہ قصور کا عفریت اسے ہر آن تنگ کرتا ہے۔ یہ عفریت نہ اسے اپنی ذات سے باہر نکلنے دیتا ہے نہ اپنی ذات میں محفوظیت بخشتا ہے (کمرے سے باہر کا خوف) حادثات اور کیفیات کا سفر شاہد جمیل کے یہاں کبھی ختم نہیں ہوتا ہر نیا عہد نئے انداز سے صید افگن ہوتا ہے سرستا کے چند لمحے ایک غیر مختتم درد کا باعث بن جاتے ہیں۔ شاہد جمیل کہتے ہیں:

سفر شروع ہوا تھا
عجب سرور کے ساتھ
کہ ہر امنگ سے لپٹا تھا عزم نو کا غرور
تمام ہمتیں جوش و خروش میں مستور
تمام حوصلے وعدوں کی دید سے مخمور
ہر ایک وعدے کے سر پہ سجا یقیں کا تاج
ہر اک یقیں میں جڑے سچ کی آنکھوں کے ہیرے
ہر ایک ہیرے میں روشن امید امید سے خواب

- - - - - - - - - - - - - - - -

سفر ابھی بھی ہے جاری
نشہ ابھی بھی ہے طاری

- - - - - - - - - - - - - - - -

سفر یہ جاری رہے گا

- - - - - - - - - - - - - - - -

سفر یہ ختم نہ ہوگا
سفر یہ جاری ہے!
ہمارے عہد کی یہ رات کتنی بھاری ہے!!

(بیمار عہد کا المیہ)

شاہد جمیل رومانی واردات کو فلسفہ بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ اپنے تخلیقی رویے میں اولاً اپنے ارد گرد ایک تنگ دائرہ بناتے ہیں پھر اس دائرے سے باہر ایک بڑا حلقہ بناتے ہیں اور پھر اس سے بڑا دائرہ اور یوں فنکار کے مرکز کے توجہات مسدود ہوتے ہوتے قاری تک پہنچتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قاری کبھی اپنے فنکار کو DISOWN نہیں کرتا۔ مجموعہ "خوابوں کے ہمسائے" کی تخلیقات جو صفحہ ۱۹۳ سے ۲۲۰ تک پھیلی ہوئی ہیں اور جن پر STRICTLY PERSONAL کی پرچی لگی ہوئی ہے ـــــ وہ بھی اسی لئے قاری کے حصے میں اسی طرح آجاتی ہیں جس طرح دوسری تخلیقات۔

غزل سے شاہد جمیل کی دوستی نہیں نبھتی۔ عام طور پر دونوں تکلف سے ملتے ہیں۔ اس کے باوجود کچھ لمحے ایسے ضرور مل جاتے ہیں جہاں دونوں میں قربت اور ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ مثلاً:

تو تنار رہتا ہے کمرے میں اندھیرا شاہد
دھوپ دیوار کے اُس پار دھری رہتی ہے

وہ خوش نصیب تھے، اِک دوسرے کے دشمن تھے
مرا مقابلہ ہر موڑ پر مجھی سے تھا

جو بھید اصل تھا وہ تو کبھی کھلا ہی نہیں
میں جس کا عکس ہوں وہ میرا آئینہ ہی نہیں

سحر تک نہ آخر کھلا کون ہے
مری نیند میں جاگتا کون ہے

کسی کی یاد بھی کتنے ہجوم رکھتی ہے
اکیلا رہ کے میں سارے زمانے والا ہوں

خوشی کے نام پہ تمام عمر یوں گزر گئی
نئے نئے غموں کے انتخاب میں مگن رہے

تنہائی سے بہتر کوئی ساتھی نہیں ہوتا
ٹکرا کے چلے جاتے اسی آواز سے کھیلو

دھواں، غبار، لہو، پیاس، کچھ تو لیتے جاؤ
ہمارے شہر سے لوٹو گے اور خالی ہاتھ؟

اداس رہ کے بھی شاہد غم آشنا نہ ہوئے
تمام عمر اسی بات کا تو رونا تھا

ترا قصہ تو اب مشہور ہو گا
مری رُسوائی سے ٹکرا گیا ہے
مری تنہائی میں اب کیا نہیں ہے
تری یادوں کا موسم آگیا ہے

یہ مخلوق اپنے لئے مسئلہ ہے
وفا کرنے والوں کو نایاب کر دے

پہلے لفظوں میں معنی تھے
اب ان میں مطلب ہوتا ہے

یا تو برسوں کچھ نہیں ہوتا
یا پھر روز و شب ہوتا ہے

ترکِ تعلقات بھی کچھ ہونا چاہئے
یکسانیت سے زندگی اکتائی جاتی ہے

آنکھوں کے دیئے کب سے جلا رکھے ہیں شاہد
کھڑکی میں ابھی تک کوئی سایہ نہیں اُبھرا

رنگ بھرتی ہے اُفق تا بہ اُفق یاد اس کی
شام ہوتی ہے تو کچھ ایسا سماں رہتا ہے

وہ جو کچھ تجھ میں نظر آتا ہے اک دوری سے
آ کے نزدیک سے دیکھوں تو پتہ ہی نہ چلے

غزل کے فارم میں شاہد جمیل نے کئی تجربات بھی کئے ہیں۔ لیکن یہ تمام تجربات اس کی ہیئت کے احترام کے ساتھ کئے گئے ہیں۔ جنوری تا دسمبر کی تمام غزلیں تجربے کی اسی بھٹی میں FUEL کا کام کرتی ہیں۔

شاہد جمیل کی شاعری ذات و کائنات کا احاطہ کرتی ہے اور اس طرح کرتی ہے کہ ذات کو مرکزی نقطہ مان کر احساسات کا دائرہ پھیلتا جاتا ہے۔ شعاعیں ایک منطقے سے چھوٹتی ہیں اور چہار دانگ عالم میں سفر کرنے لگتی ہیں۔ نجی محسوسات کا خزانہ ہوتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ واقعی اس خزانے میں ایسے محسوسات و موضوعات ہوں جو اپنے تنوع کے لحاظ سے بیرونِ ذات دور دراز خطوں میں FAMILIAR ہو سکیں۔ بسا اوقات فن کار اپنے آپ میں ہی اس قدر منہمک ہو جاتا ہے کہ ماورائے ذات کی اسے خبر نہیں ہوتی۔ فن کار اپنے جذبے میں لت پت ہو کر رہ جائے تو وہ خلائق کا مرجع نہیں بن پاتا۔ یہ باتیں میں اس لئے لکھ رہا ہوں کہ شاہد جمیل ہی ان نزاکتوں کو سمجھ سکتے ہیں اور اپنے فکر و فن کی خوشبو دور دور تک پھیلا سکتے ہیں۔ توقعات اسی سے قائم کی جا سکتی ہیں جو ان کا بھرم رکھ سکتا ہے۔ شاہد جمیل کی شاعری بہرحال ہمارا اپنا تخلیقی تجربہ بن گئی ہے۔ ●●

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
مارواڑی کالج، بھاگلپور (بہار)

شاہد جمیل کی شاعری میں سچے خواب کی بُنت کاری

شاہد جمیل کی شاعری معروضی طور پر نظری اور تاثر کے لحاظ سے انسانی ہے۔ انہوں نے غزلیں اور نظمیں کہی ہیں اور ندی کے دو دھارا کی طرح نظم و غزل کا دریا بہاتے ہوئے اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔

شاعری میں شاہد جمیل کے خیال کا اظہار دور تک، گہرائی تک اور اندرون تک نظر آتا ہے، زندگی کو سمجھنے کا فلسفہ سامنے آتا ہے۔ اور شعور کی وابستگی کا منظر نامہ ایک بڑے کینوس کی شکل میں اُبھرتا ہے۔ جہاں ایک طرف نفس مضمون اور مواد ہے اور دوسری طرف اسلوب اور طرز ادا ہے۔ اچھی شاعری کو اسلوب اور طرز ادا دراصل مخصوص مزاج اور لہجے اور حرکات و نشوونما سے ملتا ہے۔ میتھو آرنلڈ نے لکھا ہے کہ اعلیٰ تر صداقت اور سنجیدگی کو اعلیٰ شاعری کے مواد اور نفس مضمون میں اسلوب کی فوقیت اور اس کے نشوونما و حرکات سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دونوں فوقیتیں ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور ایک دوسرے سے گہری مطابقت اور PROPORTION رکھتی ہیں۔ کسی شاعر کے مواد اور نفس مضمون میں شاعرانہ صداقت اور سنجیدگی جتنی کم ہوگی اسی قدر اس کے اسلوب اور طرز ادا میں بھی اعلیٰ شاعری کے نشانات کم ہوں گے۔ اسی طرح اعلیٰ انداز نگارش اور حرکات کی نشانیاں کسی شاعر کے اسلوب اور طرز ادا میں اگر کم ہوں گی تو اعلیٰ صداقت اور سنجیدگی کی اسی قدر کمی اس کے نفس مضمون اور مواد میں پائی جائے گی۔

شاہد جمیل کی شاعری کا مواد اشیا کے بارے میں ان کا رویہ زندگی پر ان کی تنقید، ان کی وسعت نظر، ہوشمندی اور اعلیٰ و بلند سنجیدگی سے بھرپور ہے۔

حادثے یوں نہ متحد ہوتے
یہ سفر قسط وار کرنا تھا

تمہاری دی ہوئی اکتاہٹوں کا کیا کہنا!
میں رات کھل کے بغل گیر زندگی سے تھا

نہ کوئی ڈور، نہ بندھن، نہ راستہ، نہ غبار
یہی کہ اس کے مرے بیچ فاصلہ ہی نہیں

کانٹے بچھا کے پاؤں میں، خوابوں میں رکھ کے پھول
دنیا نے اپنے رنگ میں ڈھالا ہے کس طرح

طرب کی گرد ستارے لیے کھڑی جاری
الم بہ شیشۂ دل انعطاف سے سرشار

آکاش چھوتے ہوئے یہ قیمتوں کے ہونٹ
یعنی ہمارا قد بہت اونچا دکھائی دے

نظموں میں بھی شاہد جمیل کا پرواز تخیل اور جدت تخیل حکایاتِ زندگی کی جزئیات نگاری میں مصروف ہے ؎

کواڑوں میں کی ہول سے آنکھ عفریت کی جھانک کر دیکھتی ہے
قریں' وینٹی لیٹر' کے چمگادڑیں جھولتی ہیں
کتابوں کے ٹیبل سے چمٹا ہوا سانپ پھن کاڑھتا ہے
وہاں ہینگر سے لٹکتا ہے بچھو
لپکتا ہوا چڑھ گیا کارنس پر کوئی کیکڑا ہے
وہ ٹی وی کے پیچھے ہوتی ہے جو سرسراہٹ کسی کا کروچ کی نہیں ہے
ادھر لیمپ کی اوٹ سے گھورتی چھپکلی کر رہی ہے اشارے
مسہری سے لگ کر کریہہ اور بدشکل مکڑا کھڑا ہے
لحاف اور بستر میں تکیہ کے نیچے، سرکتے ہوئے کنکھجوروں کا دل ناچتا ہے
مری آنکھ میں زہرگیں ساعتوں سے لرزتی ہے دیوار
کلنڈر بھیانک خموشی میں پر پھڑپھڑاتا ہے
کھا کر ہواؤں کے تھپیڑ بڑے زور سے چیختا ہے۔ نکل جاؤ
(اقتباس۔ نظم۔ کمرے سے باہر کا خوف)

وقت کے کرب کو اجاگر کرنے کا انداز شاہد جمیل نے "نیا سال" کے پس منظر میں کچھ یوں اپنایا ہے کہ تلخ حقیقت آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اس نظم سے یہ اقتباس دیکھئے :

آشاؤں کے بھولے پنچھی کو
اب کیسے کوئی سمجھائے
آتا ہے نیا ہر سال، مگر
ہر کام پرانا کرنا ہے
ہر روز نکلتا ہے سورج
پر رات تو بڑھتی جاتی ہے
ہر صبح چٹکتے ہیں غنچے
اور آنکھ برستی جاتی ہے
ویسے ہی فسادی ہاتھوں سے
گھر اب بھی جلائے جاتے ہیں
ہاں اب بھی خون کی ہولی سے
تیوہار منائے جاتے ہیں

ہر کام پرانے سال کا ہم
ہر نئے برس میں کرتے ہیں
مرنے کو زندہ رہتے ہیں
اور زندہ رہ کر مرتے ہیں

شاہد جمیل کی نظمیہ اور غزلیہ شاعری میں 'یاد' کو بے حد اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے یاد کو کسی نہ کسی بصیرت کی خارجی اور باطنی تجسیم کے ہم معنی میں استعمال کیا ہے اور دو اجزا کے انضمام سے یاد کے ڈھانچے یا تنظیم کو متشکل کیا ہے جس کا ایک جزو قدر یعنی VALUE ہے اور دوسرا لسانیاتی تنظیم یا TEXTURE ہے یہ بصیرت خالص انفرادی اور ذاتی بھی ہے۔ اور ان اقدار کے انکشاف سے بھی عبارت ہے جس کے لئے شاہد جمیل کا شعور ایک معمول یا MEDIUM کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ انہوں نے ارتباط کلی اور مطلق ہم آہنگی کو پیش نظر رکھا ہے ؂

الفاظ سے کھیلو، کبھی آواز سے کھیلو
یادوں کا کھنڈر ہے اسی انداز سے کھیلو

کسی کی یاد بھی کتنے ہجوم رکھتی ہے
اکیلا رہ کے میں سارے زمانے والا ہوں
کسی کے پاس رہوں تو کسی کی یاد آئے
میں اب کی بار یہ غم بھی اٹھانے والا ہوں

یاد سی چیز کوئی لا کے شفق پر رکھ دی
شام کو شام سے اس طرح جدا ہم نے کیا

ان دنوں کا ذکر کیا جب بے تکلف خوب تھے
دوستوں کے درمیاں یہ فاصلہ کچھ بھی نہ تھا

مری تنہائی میں اب کیا نہیں ہے
تری یادوں کا موسم آ گیا ہے

یاد کو بیان کرنے کا تیور نظموں میں کچھ اور انداز سے ہے۔ ایک خاص قسم کی کیفیت سے محظوظ کرانے کا ہنر شاہد جمیل کو خوب آتا ہے ؎

تمہاری یاد آتے ہی
دھماکے ٹوٹ پڑتے ہیں
بھڑک اُٹھتے ہیں پھر شعلے
سرنگوں سے الگ ہو کر ہزاروں سنگ ریزے
اور دھوئیں کے لاکھوں مرغولے
خلا میں آڑے ترچھے زاویوں میں پھیل جاتے ہیں
اکیلا، سرمئی، گہرا سکوں
دل کے کھنڈر میں مسکراتا ہے
تمہاری یاد سے مانوس اندھیرا
جگنوؤں کا جسم بن کر
جگمگاتا ہے

(اقتباس۔ نظم: تمہاری یاد)

ایک اور نظم کے یہ مصرعے ؎

مگر میرے لئے یہ مرحلہ کچھ مختلف ہے
یاد کروں میں تمہیں یا تم ہی مجھ کو یاد آؤ
ایک وحشت، اک قیامت، اک بلا ہر حال میں
مجھ سے لپٹ کر جھول جاتی ہے
تمہیں کھونے کا غم ہو
یا نہیں پانے کی غفلت
مجھ میں کوئی چیز تم سی لوٹ آتی ہے

(اقتباس۔ نظم: وقت اور یاد)

ایک دوسری نظم کے یہ اشعار ؎

سنہری، کاسنی، دھانی لوؤں کے لاکھوں چراغ
جو 'نور ہال' بناتے ہیں کہکشاں کی طرح
لپٹ کے ان سے سنورتی ہے یاد
حد سے پھر گزرتی ہے یاد

کسی ستارے کو رستے میں چھوڑ دیتی ہے
کہیں یہ چاند کا آئینہ توڑ دیتی ہے
کبھی اُجالوں میں کچھ تیرگی ملاتی ہے
کہیں اندھیرے میں کچھ نور پھینک آتی ہے

(اقتباس۔ نظم: یاد بے مدار ہے)

یاد کو یاد کرنے 'کا' بیان کرنے کا ایک اور انوکھا انداز یہ ہے ؎

لہٰذا جیسے جیسے آپ کی سوچیں سلگتی ہیں
یاد کی دیوار کی اینٹیں پگھلنے کی بجائے
اس کی اونچائی ہی بڑھتی ہے
یاد کی دیوار کی اونچائی کا اندازہ کرنا کافی مشکل ہے
بسا اوقات یہ تو عرش سے بھی کافی اونچی لگنے لگتی ہے
یاد کی دیوار کے اس پار جانے کا کوئی رستہ نہیں ہے
اُس طرف کیا ہے
کسی نے آج تک دیکھا نہیں ہے

(اقتباس۔ نظم: یاد کی دیوار)

ایک اور نظم سے یہ اقتباس ؎

آوارہ سب رنگ ہوئے میری آنکھوں کے
دُکھ کی یاد میں خوابوں کا رُخ موڑ چکی ہیں
میں کس دل سے تن کے بھیتر دھوپ نہادوں
بادل کے ارمان سجاؤں
اور سنہری، سبز، گلابی، دھانی کھڑکی
مجھ میں نہ کھول
میرے من کے اندر جتنی دھند ہے مولا
اس کو ہی کر دے انمول

(اقتباس۔ خالی مکان میں ایک دعا)

شاہد جمیل نئی اور منفرد آواز کے مالک ہیں۔ ہلکے اور گہرے رنگوں سے شاعری کی بنت کاری کا، تانا بانا تیار کرنے کا فن انہیں آتا ہے۔ ان کی شاعری ذہنی کائنات کی پختگی اور ان کے تخیل کی نزاکت کی بیک وقت

آئینہ دار ہے۔ انہوں نے زندگی کے المیوں اور تلخ حقیقتوں کی کڑی دھوپ کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ 'یاد' کے سلسلے میں ہی ایک دوسرے کرب سے بھی انہیں گذرنا پڑا ہے جس کے اظہار میں خون کے آنسو ٹپکتے نظر آتے ہیں۔ ان کا چھوٹا بھائی سولہ سال کی عمر میں ایک کشتی کے حادثے میں گہرے پانی کی نذر ہوگیا تھا۔ ساجد شاہین کے ابدی غم کو بوجھل بے خواب، نیم خوابیدہ کیفیت اور نیم وحشت زدگی کے عالم میں انہوں نے اپنے اندر تابندہ رکھا ہے ؎

آنکھ مچولی کھیل میں بھی اک حد ہوتی ہے
یہ تجھ کو معلوم نہیں کیا میرے بھائی ؟
آنگن، چھت سب دیکھ رہا ہوں
غائب ہے تو
سمجھا، لیکن چھپا چھپی میں یہ تری جدت مجھے نہ بھائی
کھیل کھیل میں چھُپ گیا جا کے
قبر کے اندر !

(اقتباس۔ ایسی بھی کیا آنکھ مچولی)

چھوٹے بھائی کو سوچ کے دائرے میں اور اپنے آس پاس محسوس کرنے کا کرب یوں بھی ابھرا ہے ؎

یہ تری قبر ہے !
یا مرا صبر ہے ؟
قبر سے صبر تک کا سفر کچھ نہیں۔ کچھ نہیں اک مسلسل اذیت کا زندہ اندھیرا کھنڈر،
میں تری قبر پر فاتحہ کے بہانے سے مکڑی کے جالے بنوں (اور تو ؟)
تو مرے صبر میں مسکراہٹ کے جگنو اڑاتا پھرے۔

(اقتباس۔ قبر سے صبر تک کا سفر)

جگنو کی روشنی کو شاہد جمیل اپنی ذات کا حصہ اس طرح بنائے ہوئے ہیں۔

اے مرے معصوم بھائی !
وقت سے ہٹ کر، صدا سے دور، لفظوں سے پرے
میں تمہیں ہر لمحہ، ہر ساعت وہیں پر سن رہا ہوں
تم مجھے جس لمحہ جس ساعت جہاں پر سوچتے ہو

لوگ جھوٹے ہیں جو کہتے ہیں کہ
تم تو مر چکے ہو !

(اقتباس۔ نظم : ایک بے آواز مکالمہ)

شاہد جمیل غزلوں میں بھی ایسی فضا قائم کرنے میں کامیاب ہیں ؎

تُو تو نگارِ قوسِ قزح تھا قدم قدم
یہ کیا ہوا کہ دُھند میں ڈھونڈا کروں تجھے
شاہین تھا، اُڑان تری یوں بھی اور تھی
میں اور نیوں کہ ریت میں ڈھونڈا کروں تجھے

ہزار آہٹیں صدقے، ہر انتظار نثار
مگر وہ سامعہ ایسا کہ باصرہ منسوخ

لہو کا سبز پرندہ ! گماں کا سرخ آکاش !
یقیں کے پاؤں میں زنجیرِ درد جھوٹ کہ سچ ؟

ہوئے جو تجھ پہ مہ و انجم مہرباں' لاریب
میں ریت ریت شکستہ، تو آسماں' لاریب

تو جا کے چھُپ گیا یوں بادلوں کے پار کہیں
کہ ہر اصول کھنڈر اور ہر قسم آسیب

ترے عدم کا فسانہ بیاں بیاں موجود
مرے غموں کی حقیقت زباں زباں خالی

شاہد جمیل کی تخلیقی توانائی ذات پر اعتماد و ایقان میں ہے۔ انہوں نے لفظوں کی معنویتی تمثال و پیکر تراشی، علامتیں، استعارے، تشبیہات، نئے زاویوں اور نئے رویوں کے ساتھ اپنائی ہے۔ اس لئے ان کی نظموں اور غزلوں میں ایک نیا ذائقہ ملتا ہے ؎

ہر چہرہ سلگتے ہوئے قطروں میں بٹا ہے
ہم سب کو سمندر سا کوئی لوٹ رہا ہے

غم سے بے لاگ جو مسرور رہا برسوں تلک
زندگی آج وہی پھول سا چہرہ مانگے

وہ اپنا نام ہتھیلی پہ میری لکھ دے گا
یہ رشتہ جوڑ نہ پاؤں تو انتظار کہوں

زندگی کے موسم کو ڈھونڈتے ہیں سڑکوں پر
خود سے بے خبر سے ہیں کچھ نئے نئے چہرے

فاصلوں کو بتا دو!
سرخ موسم کا رنگِ زباں ۔ ذائقوں کا کوئی بھی سماں لے کے آئے
بے شجر راستوں کا دھواں ۔ بن کے سورج کوئی ذوقوں کے کرشمے دکھائے
دھوپ کی بیلیوں میں جہاں کوئی چھاؤں انہیں جھیلتے جھیلتے تھک سی جائے
پھر بھی
شوقِ سفر کی جبلت
اپنے قدموں میں قائم رہے گی
(اقتباس ۔ نظم : آوارگی کی حمایت میں ایک خشک نظم)

شاہد جمیل کی نظمیہ اور غزلیہ شاعری میں یاس اور نا امیدی کے ساتھ جذبات و احساسات کی رنگینی بھی ہے اور دکھ کے گہرے سائے اور رنجوں کے المناک سویرے بھی ان کی شاعری میں ایسے زندگی شبیہ ابھر کر سامنے آتی ہے جو شانے جھٹک کر اپنے ماحول کے زنداں میں اسیر ہونا ناپسند کرتا ہے ۔ اور آزاد فضا میں بھی سانس لینا چاہتا ہے ۔

شاہد جمیل کی سوچ میں انفرادیت اور اسلوب میں تازگی ہے ۔ ●

ڈاکٹر محفوظ الحسن
شعبۂ اُردو مگدھ یونی ورسٹی، بودھ گیا

شاہد جمیل کی شاعری

(’خوابوں کے ہم سائے‘ کی روشنی میں)

جدید تر اُردو شاعری کے افق پہ طلوع ہونے والا ایک روشن ستارہ شاہد جمیل کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ شاہد جمیل نے آج سے چھبیس ستائیس سال قبل ادبی دنیا میں قدم رکھا تھا لیکن ان کی منزل کیا ہوگی اس کا پتہ انہیں نہیں تھا۔ انہوں نے بچوں کے لیے نظمیں لکھی، ناول لکھنا اور شاعری کی۔ غرض یہ کہ نثر ہو یا نظم و شعر دونوں اصناف میں ان کا اشہب قلم دوڑا ہے اور خوب دوڑا ہے۔ لیکن مختلف اصناف ادب میں بھاگ دوڑ انہیں راس نہیں آئی اور بالآخر انہوں نے صنف شاعری کو ہی اپنے لئے منتخب کر لیا۔

شاہد جمیل جس نسل سے تعلق رکھتے ہیں ان میں بیشتر کی کئی تصنیفات و تخلیقات کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن شاہد جمیل کے پیش نظر ہمیشہ ”بقامت کہتر بقیمت بہتر“ کا اصول رہا ہے اس لئے انہوں نے بہت ٹھہر ٹھہر کر انتہائی غور و فکر کے بعد اپنی تخلیقات پیش کی ہیں اور انتخاب پیش کی ہیں اس لئے کہ ان کے پیش نظر یہ بات بھی رہی ہے کہ ’جو دل پہ گزرے اسی کی تصویر صفحہ پہ کھینچے۔

شاہد جمیل کی شاعری واردات کی شاعری ہے مشاہدات کی اور تجربات کی شاعری ہے یہ آمد کی شاعری ہے۔ یہ اوڑھی ہوئی جدیدیت یا لادی ہوئی قدامت نہیں ہے۔ جو انہوں نے محسوس کیا ہے جو ان کے دل پہ گذری ہے اور جو دنیا پہ گزرتے ہوئے انہوں نے دیکھا ہے، جس ماحول میں آنکھیں کھلی ہیں اور ماحول نے جس طرح کا برتاؤ ان کے ساتھ کیا ہے اسی کو انہوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ اس لئے ان کی شاعری میں نام نہاد جدیدیت کی کوئی جھلک نہیں ملے گی۔ ہاں دور جدید کا کرب گھٹن اور تعلقات کی نئی زنجیریں جو آج کا مقدر ہیں ان کی آواز شاہد جمیل کی شاعری میں ضرور سنائی دیتی ہے۔

شاہد جمیل نے اپنی مختصر سی اس عمر میں بہت سارے انقلابات دیکھے ہیں، ملکوں کی تقسیم دیکھی ہے، نفرت کے شعلے دیکھے ہیں، خوفناک اور خون آشام جنگیں دیکھی ہیں، خونیں انقلاب اور پُر امن الٹ پھیر بھی دیکھا ہے۔ سرد جنگ کے خطرات کو بھی جھیلا اور محسوس کیا ہے اور ملکوں کی داداگیری بھی دیکھی ہے، مذہب اور زبان کے نام پہ خاک و خون میں لپٹی ہوئی لاشیں بھی دیکھی ہیں اور ان کے خوف و ہراس سے دہشت زدہ بھی ہوئے ہیں۔ اور یہ سارے عوامل ان کی شاعری کے جانے یا انجانے طور پہ موضوع بنے ہیں۔

” خوابوں کے ہم سائے “ شاہد جمیل کا پہلا شعری مجموعہ ہے ایک طرف شاہد جمیل کی تخلیقی بصیرت کی نشان دہی کرتا ہے تو دوسری طرف ان کے فکر و فن سے گہرے لگاؤ اور شغف کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ مجموعہ ان کے گہرے تنقیدی شعور کو بھی واضح کرتا ہے۔ اور یہی تنقیدی شعور اور تخلیقی بصیرت، فکری اور فنی آگہی ان کو اپنی نسل کا ایک منفرد فنکار بناتی ہے۔

شاہد جمیل کی شاعری کی تہہ تک پہنچنے کے لیے اگر ہم ان کے

اس بیان کو مدنظر رکھیں گے تو ان کی تفہیم میں آسانی ہوگی ۔ لکھتے ہیں ۔

"شاعری میرے لیے بے نام وحشتوں سے فرار
کا معاملہ ہے ۔ جنوں کی چکاچوند سے نمٹنے احساسات
کی آندھیوں میں بکھرے ہوئے معنی و اسلوب کے
خوش رنگ چراغوں کو بچاکر نکال لے جانے کا
معاملہ ہے ۔ خون جلانے خون سجانے اور خون کو
خواب وگلاب کر دینے کا معاملہ ہے ۔"

شاہد جمیل کی شاعری سلجھی ہے فکر و احساس کی بھٹی کو سلگانا اور پھر اس آگ کو صحیح سمت دینا احساسات و تجربات کی رو میں بہہ کر فن کے دامن کو داغدار ہونے سے بچانا اور جذبات کی تہذیب و ترتیب جب یہ سب مل جاتے ہیں تو ایک مثلث وجود میں آتا ہے جس کا نام خوابوں کے ہم سائے رکھا جاتا ہے ۔

خوابوں کے ہم سائے کا شاعر خواب بُنتا بھی ہے خواب سجاتا بھی ہے اور خوابوں سے ہراساں بھی ہے، کیونکہ خواب بننا انسانی فطرت ہے، خواب سجانا اس کا شیوہ ہے اور خوابوں سے ہراساں ہونا اس کا مقدر ہے ۔ خواب بننے کے اس عمل میں معنی و اسلوب کے خوش رنگ چراغوں کی حفاظت کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، جنوں کی چکاچوند سے نمٹنے اور احساسات کی آندھیوں کو قبضے میں رکھنا گویا خون جلانے کے عمل سے گزرنا ہے اور خون جلائے بغیر کوئی بھی فن پارہ خواب وگلاب نہیں بن سکتا ۔

انسانی زندگی کا ہر لمحہ حساب مانگتا ہے، شاعر نے ہر لرزتے ہوئے لمحے کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے تاکہ باہر کے خوف سے فرار حاصل کرلے ۔ وہ اس عہد بیمار سے اچھی طرح واقف بھی ہے اور اس عہد کے المیہ سے بھی ۔ اس کے باوجود وہ ہمت نہیں ہارتا ہے اور خوابوں کی ہمسائیگی میں جینے کا آرزومند رہتا ہے تاکہ اس کی تنہائی کسی ماضی کی یاد سے بوجھل نہ بن جائے اور یاد جو بے مدار ہے اس کے وجود کا آسیب نہ بن جائے اس لئے جب وہ جنگل کو اُداس دیکھتا ہے تو زرد پتیوں سے سمندر کی آوارگی کا پتہ پوچھتا ہے، اور خود احتسابی کی منزل سے گزرتا ہوا خالی مکان میں دعا کرتا ہے کہ وہ دھند کی تجسیم سے باہر ہو اور زندگی کے بے نام سمندر کے بھنور جال کو توڑ دے، لیکن بار بار ایک گونگا ایک سوال قبر سے صبر تک کے سفر میں بے آواز مکالمہ سناتا رہتا ہے اور نہ چاہنے کے باوجود آنکھ مچولی کا کھیل جو اس کے خیال میں ناپسندیدہ کھیل ہے کھیلنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے ۔ وہ ایک ایک کھنڈر سے سرگزشت لمحہ موجود پوچھتا ہے تاکہ اپنے قرض کو ساحلوں تک پہنچا سکے اور اپنی حقیقت کو دریافت کرسکے تاکہ اس کے نام کا روشن ستارہ کسی روایت کے دہرائے جانے کے عمل کے بوجھ کو سہہ سکے ۔ یہی بنیادی نکتے اس کی شاعری کا فلسفہ بھی مرتب کرتے ہیں اور اس کی زندگی کا بھی زندگی جو بظاہر سامنے سے ایک سوال معلوم ہوتی ہے اور بباطن یہ ایک بیکار بحث کی حیثیت رکھتی ہے ۔

خیالات کی پیش کش میں ندرت، موضوعات کے انتخاب میں جدت اور الفاظ کی تراش خراش میں شاہد جمیل کی نظمیں سحر کارانہ اثر دکھاتی ہیں ۔ بالخصوص چھوٹی چھوٹی نظموں میں ان کا فن پوری طرح نکھر ہوا ہے، مایوسی کا احساس، تنہائی کا کرب ہلکی ہلکی ملگجی رومانی فضا شاہد کی نظموں کو نہ صرف خوبصورت بناتی ہیں بلکہ ان میں جو فکری گہرائی اور تخلیقی بصیرت ہے وہ ایک نیا زاویہ نظر بھی عطا کرتی ہیں ۔

اس مجموعی اور تمہیدی تاثرات کے بعد ان کے چند نظموں کا تفصیلی مکالمہ کرتے چلیں ۔ یوں تو ہر خیال اپنے اظہار کے لئے خود ہی پیکر کا انتخاب کرلیتا ہے ۔ اس حقیقت سے آگاہی کے باوجود مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کی پابند نظمیں فنی طور پہ زیادہ کامیاب ہیں اور پراثر بھی خواہ انہیں آپ نصابی تنقید کے انداز سے دیکھیں یا کوئی اور طریقہ اپنائیں، میرے کہنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آزاد نظموں میں ان کا فن نکھرا نہیں ہے بلکہ مراد مدعا یہ ہے کہ نسبتاً پابند نظمیں ابلاغ و ترسیل کی منزلوں سے زیادہ آسانی سے گذر جاتی ہیں کہ ان میں علائم کا استعمال یا استعارات نے آزاد نظموں سے کم جگہ پائی ہے ۔

پابند نظموں میں سرگزشت لمحہ موجود ۔ نیا سال ۔ ماضی کہیں نہیں ہے ۔ روایت، خوابوں کے ہم سائے، تم خواب سہی . . . اتنا سکوں کس

کام کا۔ فکری اور فنی اعتبار سے نہ صرف کامیاب نظمیں ہیں بلکہ ان میں پیش کئے گئے خیالات کی طرفگی اور اظہار و بیان کی ندرت شاہد جمیل کے انفرادی طرزِ فکر اور موضوعات سے ان کی ذہنی وابستگی کا پتہ دیتی ہیں، ان نظموں کی ہلکی رومانیت اور ان کی فضابندی میں انفرادیت کی عکاسی فن سے ان کے خلوص کی نشان دہی کرتی ہیں۔

ایک مختصر سی نظم رُوایت ملاحظہ ہو۔

مجھے افسوس نہیں ہے کہ وہی تم نے کیا !
اور حیرت بھی نہیں اس پہ، کہ جو کچھ بھی ہوا !
تم نے جو کچھ بھی کیا، سب ہی کیا کرتے ہیں
لوگ تو یوں ہی بس ایسوں کا گلہ کرتے ہیں
میں گلہ کیوں کروں، میں لوگوں میں شامل کب ہوں
تم کوئی شمع سہی، میں کوئی محفل کب ہوں
تم نے تو دنیا بسائی ہے حقیقت کے لئے
رہ گئے خواب مرے، میری ضرورت کے لئے

شاعر نے بڑی خوبی اور خوبصورتی سے نہ صرف جذبات واحساسات کی باگ ڈور سنبھالے رکھی ہے بلکہ انہیں ایک نئی دِشا دے دی ہے اور اس ندی کا رُخ یکسر موڑ دیا ہے جو سیلاب بلا بن کر نہ جانے بہا کر فنکار کو کہاں لے جاتا، جذبات کا اتار چڑھاؤ اور لہجے کا دھیما پن اور اس دھیما پن میں ایک کسک ایک خلش ایک اَن کہی بات کا احساس کرا دینا بے حد لطف انگیز معلوم ہوتا ہے۔

ایسی ہی ایک خوبصورت نظم نیا سال ہے۔ ہر پرانے سال کو لوداع کہتے ہوئے انسان نئے سال کی آمد آمد پر خوشیاں مناتا ہے۔ تصورات کے نئے نئے اور حسین سپنے سجاتا ہے۔ دل میں نئے نئے ارمان جگتے ہیں، خوابوں کے محل تعمیر ہوتے ہیں لیکن جب جب نیا سال آتا ہے نیا سورج تو طلوع ہوتا ہے لیکن رات کا اندھیارا پہلے سے زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ کشت و خون کی ہولی میں اضافہ اور اضافہ ہوتا جاتا ہے انسان سکون کے ایک ایک لمحے کو ترستا ہے، اور زندگی جینے کا حوصلہ ہارنے لگتا ہے، اس لئے نئے سال کی آمد کی مسرت تب ہی ہو سکتی ہے جب ہم خود کو بدلنے کا عزم کریں، وحشت اور دہشت کو خیرباد کہہ دیں، ورنہ نئے سال میں بیتے سال کا کیا ہوا عمل دہراتے رہنے نئے سال کی ساری امنگیں اور حوصلے، سارے خواب اور تصورات کے قلعے خود بخود منہدم ہو جاتے ہیں۔

عام طور پہ اس موضوع پر نظم یا غزل لکھتے وقت صرف امیدوں اور خوابوں کا چراغ جلایا جاتا ہے۔ شاہد جمیل نے حقیقت سے آنکھ چرانے کی بجائے حقیقت سے آنکھ ملانے اور ماضی کی دھند سے نکل کر نئی راہ ڈھونڈھنے کی ترغیب کی شرط پہ نئے سال کو خوش آمدید کہا ہے۔ نظم اگرچہ طویل ہے لیکن پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ہر سال نیا سال آتا ہے — ہر سال امیدیں بندھتی ہیں
ہر بار نیا کچھ کرنے کو — دل میں ارمان مچلتے ہیں
ہر بار کچھ ایسا لگتا ہے — اس بار یہ سپنا سچ ہوگا
اس بار کا سورج ہر ہر دن — اک نئی کرن لے آئے گا
اس بار چمن کے سب غنچے — چہکیں گے، ہنسیں گے، گائیں گے
بے خواب آنکھوں کے دامن میں — کوئی رنگ آکے بھر جائے گا
بے نقش ہتھیلی پہ کوئی — تقدیر سی کچھ لکھ جائے گا

ہر سال نیا سال آنے پہ — آشاؤں کا پنچھی اڑتا ہے
بادل نے ہواؤں سے مل کر — خوابوں کے محل بناتا ہے
اک قطرہ نور کا مسکائے — تو رات سمندر ہو جائے
اک پھول جو باہیں پھیلائے — کل باغ معطر ہو جائے

آشاؤں کے بھولے پنچھی کو — اب کیسے کوئی سمجھائے
آتا ہے نیا ہر سال، مگر — ہر کام پرانا کرتا ہے
ہر روز نکلتا ہے سورج — ہر رات تو بڑھتی جاتی ہے
ہر صبح چٹکتے ہیں غنچے — اور آنکھ برستی جاتی ہے
ویسے ہی فسادی ہاتھوں سے — گھر اب بھی جلائے جاتے ہیں
ہاں اب بھی خون کی ہولی سے — تیوہار منائے جاتے ہیں

ہر کام پرانے سال کا ہم
ہر نئے برس میں کرتے ہیں
مرنے کو زندہ رہتے ہیں
اور زندہ رہ کر مرتے ہیں
یہ کھیل کہ جب تک جاری ہے
ہر رقص کہیں لہرائے گا
ہم جس دن خود کو بدلیں گے
اس روز نیا سال آئے گا

دور حاضر میں اس نظم کی معنویت اور فکری پہلو سے قطع نظر بیان کی سادگی اور خیالات کا تسلسل اور بین السطور جو ایک نشتریت ہے وہ ایک عجیب قسم کی مسرت بخشتی ہے۔ نظم "اے میری تنہائی اور ایک بوجھل شام کا گیت" ہیئت و اسلوب میں ایک خوش گوار تجربے کی خوبصورت مثال ہیں، شاعر تنہائی میں اپنی بازیافت اور اپنی تلاش کے عمل میں سرگرم نظر آتا ہے۔ اس نظم میں شاعر بقول محمود ہاشمی مصرعے موزوں نہیں کرتا ہے بلکہ یہ "کائنات اور فرد کی تخلیقی کشمکش اور کشاکش کے کارزار ہیں" طویل آزاد نظموں میں جو نظمیں مجھے بے حد پسند ہیں وہ ہیں بیمار عہد کا المیہ، وجود کا آسیب، دوسری طویل آزاد نظمیں مجھے اتنا متاثر نہیں کر سکی ہیں۔ مختصر نظموں میں ایک خاص احساس و کیفیت کے تحت لکھی گئی چند نظمیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں جو اگرچہ ذاتی احساسات کی نمائندگی کرتی ہیں لیکن اگر شاعر نے ان کی نشاندہی نہ کی ہوتی تو بھی ان تجربات کی آفاقیت اور صداقت پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا ہے ؎

تیرے نام سے جو خط لکھوں
اپنے پتے پر پوسٹ کروں
میرے نام تری سب یادیں
درپن کی آنکھوں سے ٹپکیں
میرے گھر کے دن رات
بارہ مہینے کی برسات

(نظم - تو نہیں جانتا)

کیا عجب ہے!
جب تلک تھا ساتھ میرے تو
مجھے وقتاً فوقتاً یاد آتا تھا
خدا جانے، خدا کے ساتھ جب سے تو ہوا ہے
کوئی لمحہ مرا تیرے تصور سے نہیں خالی

(نظم - کیا عجب ہے)

اتنی چیخیں، اتنی پکاریں، اتنی آہیں
اور خدا!
عین بہاروں کے موسم میں گل وہ سپرد خاک ہوا
اے رب کریم!
خزاں کی ایسے وقت ضرورت چمن کو کب تھی؟
یا تجھ کو معمول سے ہٹ کر کچھ کرنے کی مہلت کب تھی!!؟

(نظم - ایک گونگا سوال)

شاہد جمیل صرف نظم کے ہی شاعر نہیں۔ غزلوں پر بھی انہیں ویسی ہی قدرت حاصل ہے۔ ان کی غزلوں میں عہد حاضر کا کرب اپنی پوری توانائی کے ساتھ جلوہ ریز ہوا ہے۔ آج کی مشینی زندگی نے انسان کو انسانی رشتوں سے کتنا دور کر دیا ہے، قدریں کس طرح ٹوٹی ہیں اور شہری زندگی ہی نہیں دیہی زندگی بھی آج کے اس ماحول میں کتنی دہشت زدہ ہے، انسان اپنی شناخت کے لئے کس طرح بھاگ دوڑ میں مصروف ہے اپنی لاش اپنے کاندھے پر اٹھائے ہوئے یہ انسان کس دھند میں کھو گیا ہے۔ اور سکون کی تلاش میں کس کس در پہ دستک دے رہا ہے، یہ سب ان غزلوں میں ملتا ہے۔

زندگی اور فن دونوں کے تعلق سے شاعر کا رویہ مثبت ہے، اگرچہ غزلوں کی فضا میں بعض اوقات مایوسی کی ایک ہلکی سی ادا چھاتی ہوئی نظر آتی ہے لیکن یہ مایوسی بحر زندگی میں ڈوب کر اس آگ کے دریا کو عبور کرنے کی صلاحیت بخشتی ہے جسے زندگی اور اس کی لذتوں کو خوش آمدید کہہ سکے۔ ان غزلوں میں حسن و عشق کی داستان نہیں ملے گی نہ ہی ان غزلوں کا عاشق محرومی، مایوسی اور مجبوری کا شکار ہے اور نہ ہی جنس زدہ بلکہ وہ صرف اور صرف ایک آدمی ہے جو عشق بھی کرتا ہے اور محرومیوں سے بھی دوچار ہوتا ہے۔ کچھ پاتا بھی ہے اور کچھ کھوتا بھی ہے۔

ان کی غزلوں کے مطالعہ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ فن غزل نگاری میں اگرچہ انہوں نے روایات کی سختی سے پابندی کی ہے لیکن موضوعات کے لحاظ سے تنگنائے غزل کو وسعت دینے کی کوشش کی ہے، غزلوں میں کچھ خوبصورت اور بیش بہا تجربے کئے ہیں اور یہ تجربے ان ہی سے مخصوص ہیں۔

اردو شاعری میں بارہ ماسے کی روایت ملتی ہے لیکن اُردو غزلوں میں بارہ مہینوں کی خصوصیات اور کیفیات کا بیان شاید پہلے نہیں ملتا۔ انہوں نے رنگوں اور مہینوں کی مناسبت سے جو غزلیں کہی ہیں ان میں ایک خاص قسم کی کیفیت کا احساس ہوتا ہے اور یہ غزلیں ذاتی جذبات و تجربات کی سرحدوں کو عبور کرتی ہوئی عمومیت اور آفاقیت کا رنگ اختیار کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان غزلوں میں عصری حسیّت کے ساتھ ساتھ ذاتی کرب و جذب کی آمیزش نے ایک نئی جان ڈال دی ہے۔ اور ہر رنگ اور مہینہ اپنی تمام تر خصوصیات اور حسیات کے ساتھ ہمارے شعور کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اور یہ محض تجربہ نہ رہ کر مشاہدے اور فن کا ایک اٹوٹ حصّہ بن جاتا ہے۔

دلوں کی آنچ آوارہ پھری — برف باری میں ہے ماہ جنوری
غم دسمبر کی کتاب اولیں — اور خوشی کا حرف آخر جنوری

جنوری بند دیوار سی — کھولتی کھڑکیاں فروری
شاخیں کونپل پتے خواب — آنکھیں رنگ اور سایہ مارچ

لو: سمندر، جس کشتی کی طرح — اور اس کا بادبان اپریل ہے
دھوپ، حدت، سراب، جس غبار — حوصلو یہ حرم مئی کا ہے

دھوپ کو لنک نت نئے فاصلے — اور ان فاصلوں کی انا جون ہے
بوند نامہرباں پیاس اندھا کنواں — دل کے حالات کا زائچہ جون ہے

بادلوں میں بجلیوں کی رقص گاہیں — ساغروں میں آگ بھرتی ہے جولائی
بجلی، بادل، آب اگست — سو جیلے بے تاب اگست

بادل، رنگ، افق، آواز — خوابوں کا گرداب اگست
رنگ، خوشبو، آنکھ، منظر — پیار کا پرچم ستمبر
یاد اجلی، سُرخ دھانی — خوب صورت غم ستمبر

سرد ہوا کا کوئی جھونکا — یادوں میں کہرام اکتوبر
بھرے بھرے بازار دکانیں — سڑکوں پہ ہے جام اکتوبر

سنہری سبک سردیاں ہیں — کسی یاد جیسا نومبر
مگر وہ لہو رنگ بارش — کہ جس میں نہایا نومبر

ان نظاروں میں چھپا ہوں مجھکو ڈھونڈو — برف خواب آواز، آنسو، ڈر دسمبر
شام نارنجی دکھوں کی بھیڑ کھڑی ہے — ہر نئے غم کا پرانا گھر دسمبر

جنوری سے دسمبر تک کے مہینوں میں اپنوں کا غم سمویا ہوا تو ہے ہی، ساتھ ہی ساتھ ان غزلوں میں ان معصوموں کا خوش رنگ لہو بھی شامل ہے جو سہسرام اور بھاگلپور میں حیوانیت کا شکار ہو گئے۔ اب ان رنگوں کی دلاویزی بھی ملاحظہ ہو۔

سُرخ شب، چراغ سُرخ — دل سیہ تھا باغ سُرخ
غم کو دونوں معتبر! — سرخ دل کہ داغ سُرخ

زرد موسم، یاد زرد — اک جہاں آباد زرد
یوں نہیں لوٹی دعا — لب سیہ فریاد زرد

گل پہ خزاں تھی تو کیا — باغ شجر آب سبز
دل کا کھنڈر زرد زرد — یاد کی محراب سبز

سنہرے دکھ، غم سنہرا — چراغوں کا موسم سنہرا
تری سبز یادوں کا جادو — مرے دل کا پرچم سنہرا

فلک سے پوچھئے آداب مقتل — شفق کی شام کا مطلب گلابی
تماشے دیکھنا پھر آسماں کے — سفیدی ہو رہی ہو جب گلابی

نیلگوں دریا سمندر نیلگوں — غم سیہ غم کا مقدر نیلگوں
دل کہ اک خوش رنگ کشتی بادبانی — غم کوئی گہرا سمندر نیلگوں

سفید خواب، خواب کی سحر سفید	دھنک ہوئی سیاہ بحر و بر سفید

سرمئی خواب زاروں کا غم	غم کی ہر کہکشاں سرمئی
نور ظلمت سے اُلجھا کیا	چشم کا ہر بیاں سرمئی

سفید تو میں سفید	ترے مرے دل سیاہ
جنوں کے صحرا میں نور	خرد کی محفل سیاہ

یہ سارے رنگ، ان رنگوں کی رعنائی، بقول شاعر "ان بوجھل، بے خواب، نیم خوابیدہ کیفیات یا نیم وحشت زدگی یا خود کلامی کی کسی مخصوص کیفیت سے وابستہ ہیں۔ جن لمحوں میں میں نے اسے بہت بار سوچا، یاد کیا، اور اپنے آس پاس محسوس کیا"

شاہد جمیل کی غزلوں میں ہلکی رومانی آنچ بھی محسوس ہوتی ہے اور انسانی عظمت کی شناخت کی کوشش بھی ان غزلوں کے مطالعے سے ذہنی آسودگی بھی حاصل ہوتی ہے۔ ایک خاص کیفیت اور جذبے کی ترجمان غزلیں بھی زندگی بداماں نظر آتی ہیں اور زندگی تو جینے اور برتنے کا سلیقہ عطا کرتی ہیں۔ یہ حوصلہ مندی اور جرأت بخشتی ہیں۔ زمانے کے نئے تقاضات سے منہ موڑنے اور رونے بسورنے یا قدروں کی شکست وریخت کا ماتم کرنے کی بجائے ان غزلوں کے شاعر نے قدروں کی تعمیر کی ہے اور روایات کی بنیادیں استوار کی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں

وقت کی دھوپ تپش لاکھ اگلے دل پر
ایک گوشے میں مگر تھوڑی تری رہتی ہے

دل وہ پتھر ہے جو ہر موج سہا کرتا ہے
غم وہ ندی ہے جو ہر وقت بھری رہتی ہے

پھول مغرور ہو گئے آخر
باغ کو بے بہار کرنا تھا

اُداس بیٹھا ہے آئینہ بیچنے والا
کہ اس محل میں کوئی خود کو جانتا ہی نہیں

تھی کائنات سمندر تو اپنی ذات حباب
پر اپنی ذات میں ڈوبے تو کائنات نہ تھی

کسی کی یاد بھی کتنے ہجوم رکھتی ہے
اکیلا رہ کے میں سارے زمانے والا ہوں

ہونٹوں سے مسکراتے ہوئے غم کو کیا پتہ
آنکھوں نے آنسوؤں کو سنبھالا ہے کس طرح

دھواں، غبار، لہو، پیاس کچھ تو لیتے جاؤ
ہمارے شہر سے لوٹو گے اور خالی ہاتھ؟

پلکوں پہ نیند ہوگی نہ آنکھوں میں کوئی خواب
موسم کبھی کبھار کچھ ایسے بھی آئیں گے

تنہائی سے بہتر کوئی ساتھی نہیں ہوتا
ٹکرا کے جو پلٹے اسی آواز سے کھیلو

چہرہ تو صرف چاند کا میلا ہوا مگر
بے نوریاں سنبھالے ہوئے شہر شہر ہے

اس وقت کچھ ہے، شام کو کچھ، رات کو کچھ اور
شاہد یہ کوئی دھوپ نہیں، رنگ دہر ہے

عشق، آدم، حسن، حوا، سانپ، جنت اور گناہ
جاننا ہر شئے کو تھا	پہچاننا کچھ بھی نہ تھا

گرتی دیواروں میں کھِلاتی رہی رشتوں کی دھوپ
اس اندھیرے میں کسی کو سوجھتا کچھ بھی نہ تھا

مری تنہائی میں اب کیا نہیں ہے
تری یادوں کا موسم آ گیا ہے

ترا پھول کوئی نہ آیا مگر	بہت ہم پہ پتھر اچھالے گئے
گھٹا دھوپ موسم ہوا چاندنی	کھلونوں پہ تا عمر ٹالے گئے
جہاں اپنی تھوڑی سی پہچان تھی	اسی شہر سے ہم نکالے گئے

چشم در چشم سسکتے ہوئے جذبوں کا جمود
تخ زدہ جسم بھڑکتا ہوا شعلہ مانگے

چلا جائے تو کبھی یاد نہ آئے شاہد
آدمی اتنا وفادار نہیں ہو سکتا

لب سراب بے زاری چشم خواب سے عاری
کس قدر ادھورے ہیں یہ سجے سجے چہرے

شاہد کی غزلوں میں عہد حاضر کی ساری جھلاہٹیں، جھلملاہٹیں، مسرتیں، مصیبتیں، محرومیاں، خواہشیں، ایک نیا کیف وانبساط لئے محسوس ہوتی ہیں، ان کی غزلوں میں احساس کی ہمہ گیری، جذبہ و اظہار کی وارفتگی، روایات و تجربات کی شیفتگی اور لہجے کی انفرادیت نمایاں ہے۔ ان کا اسلوب غزل کے جدید تر شاعروں میں ان کا اپنا ہے ذاتی اور انفرادی ہے، ان کی غزلوں کی زبان مسحور کرتی ہے مبہوت نہیں۔ غالباً اس لئے محمود ہاشمی کو ان کی شاعری میں بانی جیسا انفرادی ذائقہ محسوس ہوا ہے اور کمار پاشی کو شاہد جمیل جدید تر شعرا میں اظہار و بیان پہ دسترس حاصل کرنے والوں کی صف میں اوّل نظر آتے ہیں اور بلراج کومل کو ان کی شاعری مشاہدے اور تجربے اور طریق اظہار کی دلآویز اور گوناگوں کیفیات کی حامل نظر آتی ہے۔ ●

بقیہ : جمیل و جمال

زمیں غبار ہوتی ہے کہ آسمانی تو
میں بے ثبات حقیقت، امر کہانی تو

بہر حال، بہر رنگ اور بہر حرف شاہد جمیل چونکاتے ہیں ان کا سارا مجموعہ بیک نشست پڑھ ڈالنے کی چیز نہیں بلکہ بالاستیعاب حرف حرف اس کی صنّاعی سے خوش ہونے، اس کے تیکھے پن کو دل میں محسوس کرنے اور اس کی فنی دسترس کی داد دینے کی چیز ہے۔

اس مجموعے کو شائع ہوئے تین سال ہو گئے لیکن اس کی نشتریت اور اس کی تیزابیت میں کوئی کمی نہیں آئی اور نہ آسکتی ہے، یہ رنگ ہی ایسا ہے جو کبھی پھیکا نہیں پڑتا۔ لہو کا رنگ جو ٹھہرا۔ ●

رؤف خیر

رسالہ بازار، گولکنڈہ (حیدرآباد)

جمیل و جمال

بے معنویت اور معنویت کو شعری استعارہ میں ڈھالنا حوصلہ و ہنر مانگتا ہے، شاہد جمیل اس فن میں اپنی ایک پہچان رکھتے ہیں۔ انہوں نے زندگی کی بے پناہی کو جہاں حرفوں میں قید کرنے کی کامیاب مساعی کی وہیں الفاظ کے بندھے ٹکے مفاہیم کو ان کے حصار سے آزاد کیا زندگی کی بے شمار ایسی حقیقتیں بھی ہوتی ہیں جو خرد کے حق میں گتھیاں ثابت ہوتی ہیں۔ ان کے اظہار کے لئے بھی ایسی ہی طرز کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو ان کے لئے گنجلک تک سکتی ہے جو خود ان گتھیوں کو سلجھانے کا تجربہ نہیں رکھتے۔

شاہد جمیل کے مشاہدات و تجربات گوناگوں اور متنوع ہیں اسی حساب سے ان کا پیرایۂ اظہار بھی بدلتا رہتا ہے۔ ان کا رنگِ بیان جہاں رنگارنگ کیفیات کا حامل ہے وہیں زمان و مکان کی نیرنگیوں کا احاطہ کرتا ہوا بھی لگتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی مسرتوں کو انگیز کرنے اور بڑے سے بڑے غم کو جھیلنے کا حوصلہ ان کے شعروں میں پایا جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو کوئی بے نام خوف بھی ان کی تخلیق میں ڈھل جاتا ہے۔

میرے کمرے میں
کھڑکی کا پردہ ہٹا کر درندہ کوئی گھس رہا ہے
کواڑوں میں "کی ہول" سے آنکھ عفریت کی جھانک کر دیکھتی ہے۔
ترچھی دیتی لپٹے چمگادڑیں جھولتی ہیں
کتابوں کے ٹیبل سے چمٹا ہوا سانپ پھن کاڑھتا ہے

لیکن مجھے یہ پتہ ہے
کہ کمرے سے باہر اگر میں نکل کر گیا تو
یہ سچ ہے کہ پتھر کا ہو جاؤں گا !!

(کمرے سے باہر کا خوف)

یعنی بقول غالب ؎

نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

شاہد جمیل "فرار" کے نام پر صرف خالی پن نگلتے جا رہے ہیں۔

شاہد جمیل کے پاس "خواب" اک غنائی استعارہ کے روپ میں جلوہ گر ہے۔ یہ خوابوں کی ہم سائیگی میں رہتے ہوئے ہم سائیگی کا پورا پورا حق ادا کرتے ہیں۔

تمہیں خبر کیا میں اپنے سرسبز خواب زاروں کے سائے سائے
تمہاری جیسی ہی خود پہ مرکوز رہگزر کو گلے لگائے
تمہیں نہ چھو کر، تمہیں نہ پا کر بھی کتنا خوش ہوں
میں جانتا ہوں کہ تم کو حیرت ضرور ہوگی

(خواب زاروں کے سائے سائے)

شاہد جمیل محض ماضی کی حسین یادوں میں محصور رہ کر کسی بے حوصلگی کو راہ نہیں دیتے۔

وہ دور ہے تو کیا ہے/ غم پاس ہے تو کیا ہے/ احساس ہے تو کیا ہے
میں پھر بھی جی رہا ہوں۔

(ماضی کہیں نہیں ہے)

ان کی زبان بہت فکر انگیز بھی ہے۔ یہ اپنے تعارف میں جو اشارے دیتے ہیں وہ شعریت سے بھرپور ہوتے ہیں۔

میں ایک ٹوٹا ہوا ستارہ نجانے کس کی سحر میں گم ہوں
میں اک بجھتا ہوا نظارہ نہ جانے کس کی نظر میں گم ہوں
میں ایک اُجڑا ہوا جزیرہ نہ جانے کس کی خبر میں گم ہوں
میں ایک ہارا ہوا پرندہ نہ جانے کن بال و پر میں گم ہوں
میں ایک زندہ کہ وحشتوں کے نہ جانے کیسے کھنڈر میں گم ہوں

شاہد جمیل کے اسلوب کی ایک پہچان بارہ ماسہ کی روایت کی توسیع بھی ہے بارہ ماسے کبھی فکر و فن کے اظہار کے بہترین نمونوں پر مشتمل صنف یا ہئیت شمار ہوتے تھے۔ شاہد جمیل نے موسموں میں تقسیم کرنے کے بجائے تجربات کو ماہوارانہ و ماہرانہ اسلوب کے حوالے کر کے جذبات کے اظہار میں نسائیت کی تحدیدات سے اعراض کیا اور اس صنف کو مردانہ جذبات کی نکاسی کا ذریعہ بنایا۔

خواجہ مسعود سعد سلمان، کبیر داس، قطبن، ملک محمد جائسی، عیش وغیرہ کے قدیم بھاکا کے بارہ ماسوں کے علاوہ فارسی میں بھی یہ صنف احقر، رسال، کاظم علی جوان وہاب، بیندرابن وغیرہ کے ذریعہ ادب کی ایک مقبول جہت شمار ہوتی تھی۔ جدید اردو میں اس روایت کو جدید انداز میں شاہد جمیل نے برتا ہے۔

ہے نیا سال آ گئی پھر جنوری
ڈھونڈتی ہے کس کو آخر جنوری

راکھ ہے یا دھواں فروری
جنوری کا زیاں فروری

پت جھڑ کر کے لوٹا مارچ
شاخوں پر جا بیٹھا مارچ

کن پرندوں کا بیاں اپریل ہے
ہر شجر پہ میزباں اپریل ہے

حبس ہے یا کرم مئی کا ہے
یاد اس کی عَلم مئی کا ہے

سبز موسم کی پہلی صدا جون ہے
اے گھٹا اے گھٹا یہ دعا جون ہے

بارشیں زنداں قیدی ہے جولائی
اے مرے دل تیرے جیسی ہے جولائی

بجلی بادل آب اگست
سو جیلے بے تاب اگست

کس ستم کا غم ستمبر
چاند مدّھم نم ستمبر

کس دل کا آرام اکتوبر
ایک گلابی شام اکتوبر

دھواں ہے نہ شعلہ نومبر
مرے دل سے اچھا نومبر

ہجر کی آنکھوں کے سب منظر دسمبر
اس کلنڈر میں ہے سالوں بھر دسمبر

("ذکر و مطالعہ" کے مصنف محمد ذکی الحق (لکچرر

پٹنہ یونیورسٹی) نے بارہ ماسے پر قابلِ قدر تحقیق کی تھی اور ان کی بڑی خواہش تھی کہ جدید شعراء بھی اس روایت کو آگے بڑھائیں وہ آج بقیدِ حیات ہوتے تو شاہد جمیل کی اس شعری روایت کی سعی احیاء سے بہت خوش ہوتے)

شاہد جمیل نے رنگوں کی نفسیات کو بھی اپنی غزلوں کی ردیفوں کے حوالے سے اجاگر کرکے اپنی شناخت کا اک اور وسیلہ بنایا ہے۔

سبز خلا خواب سبز　　　کائی میں گرداب سبز

دل پہ ہر تحریر زرد　　　کاغذی اسناد زرد

میں اک رات ہر رات بے خواب　　　تو اک خواب ہر دم سنہرا

فلک سے پوچھئے آدابِ مقتل　　　شفق کی شام کا مطلب گلابی

آسماں کا دوست ہے دل کا پرند
جسم سارا سُرخ، شہپر نیلگوں

نظامِ روشنی گھروں میں تھا عجب
دریچے سرمئی تھے اور در سفید

سرمئی جسم، جاں سرمئی　　　درد کے سب جہاں سرمئی

سفید تو، میں سفید　　　ترے مرے دل سیاہ

مزے کی بات یہ بھی کہ شاہد جمیل کی غزلیں موضوع کے اعتبار سے جتنی مختلف الالوان ہیں وہیں مختلف الاوزان بھی ہیں جن سے شاہد جمیل کی تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ عروضی دسترس کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

شاہد جمیل کے شعری مجموعے "خوابوں کے ہم سائے" کا سب سے زیادہ متاثر کن حصہ وہ ہے جسے انہوں نے اپنے مرحوم بھائی (ساجد شاہین) کی یادوں سے برتایا ہے۔ ویسے یہ جدائی ایک میٹھی کسک اور زیریں لہر کی طرح ان کی دیگر بیشتر تخلیقات میں بھی کسی نہ کسی صورت میں بولتی دکھائی دیتی ہے۔

آنکھ مچولی کھیل میں بھی اک حد ہوتی ہے
یہ تجھ کو معلوم نہیں کیا میرے بھائی!
آنگن، چھت سب دیکھ رہا ہوں — غائب ہے تو
سمجھا — لیکن چھپا چھپی میں یہ تری جدّت بھی مجھے نہ بھائی
کھیل کھیل میں چھپ گیا جاکے — قبر کے اندر!!
(ایسی بھی کیا آنکھ مچولی)

اس نظم کا آخری ٹکڑا تقریباً "غیر شعری" ہوگیا ہے لیکن وہی کڑی حقیقت تھی۔ شعریت کی ترازو میں یہ نثری بھلے ہی لگتا ہو لیکن درد بھرے دل میں تیر بن کے بھی تو لگتا ہے۔

عرب کے ایک شاعر نے اپنے بھائی کا ایسا دردناک مرثیہ لکھا تھا کہ لوگ وہ مرثیہ پڑھ کر رو دیا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اس سے گزارش کرکے اپنے بھائی کی موت پر بھی مرثیہ لکھوایا تھا لیکن یہ مرثیہ اس قدر دردناک ثابت نہ ہوا۔ حضرت عمرؓ نے اس کی وجہ دریافت کی تو شاعر نے بہت مختصر سا جواب دیا کہ وہ میرا بھائی تھا اور یہ آپ کا بھائی۔

اسی لیے جو اس کیفیت سے گزرتا ہے وہی اس کی سفاکی، اس کی کاٹ سمجھ سکتا ہے اور انہیں بیان کرسکتا ہے۔ دوسرا اس کیفیت کو محسوس کرے نہ کرے اس سے شاہد جمیل کو کچھ فرق نہیں پڑتا۔

شاہد جمیل کا دل بھر آتا ہے تو وہ اک آہِ سرد کھینچ کر جو حرف دنیا کو دیتے ہیں اس سے ہر دردمند دل بھر آتا ہے۔

ہنستا گاتا رستہ دھند میں کھو جاتا ہے
کتنی آسانی سے یہ بھی ہو جاتا ہے

یقین وہم زدہ، کاسۂ گماں خالی　　　پرندہ منگوں بھرا اور آسماں خالی

(بقیہ ص۳ پر)

رونق شہری
گول گھر، جھریا (دھنباد)

زود حسی کا عنوان: خوابوں کے ہمسائے

انسان کا خواب دیکھنا ایک لاشعوری عمل ہے، اس کے تحت الشعور میں ایسی ناآسودہ خواہشات اور تمنائیں جن کی سرکوبی کرکے ہم سوچتے ہیں کہ ان پر غلبہ حاصل کرلیا، ہمیں وقتی طمانیت کا احساس ضرور دلاتی ہیں لیکن ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب اس کی تردید خواب کی دنیا میں بہت معصوم طریقے سے ہوجاتی ہے۔ خواب ایک ایسا لفظ ہے جس کے لئے کئی متبادل معانی سامنے آتے ہیں لیکن ہر ایک کی جامعیت جداگانہ اس لئے ہے کہ اس کی رونمائی اور تشریحات کا خلاصہ سائنٹفک طریقے سے یکسر ناممکن ہے۔ اس کی مطابقت کے لئے فرضی انکشافات سے ہم چند لمحوں کے لئے اپنے جی کو ضرور بہلا لیتے ہیں لیکن پھر وہی تہی نگاہی کسی غیر مرئی شے کو تلاش کر رہی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ خواب کی قربت کا اثر حسِ لامسہ پر موجود ضرور ہوتا ہے لیکن اس کا مکمل چہرہ اور خاکہ ذہن کے آئینے سے مفقود ہوتا چلا جاتا ہے۔ شعر و ادب میں ہم نے خوابوں کے دروازے بند ہوتے بھی دیکھے ہیں اور خیمۂ خواب سے دھواں نکلنے کا منظر بھی کھلی نگاہوں سے دیکھا ہے، لیکن خوابوں کی ہمسائیگی کا اس بلیغ معنی میں پہلی بار احساس ہوا کہ زود حسی چشم غلافہ جیسی کوئی چیز ہے جسے ہر کوئی خوابوں کی آبادکاری سے جوڑنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ میری مراد شاہد جمیل کے شعری مجموعے "خوابوں کے ہمسائے" سے ہے جس میں خواب و خیال کی ایسی ویران دنیا آباد کرنے کی کوشش کی گئی ہے جہاں مناظر آنکھوں سے پھسلنے کے خدشات ظاہر کرتے ہیں۔

شاہد جمیل نے خوابوں کی آبادکاری ہی نہیں بلکہ اُجڑتے موسموں کی طرح (خوابوں کی) باز آبادکاری بھی ہے۔ ایسی باز آبادکاری جہاں محرومی اور خسارے خوابناک آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مستقل پناہ گاہ بناکر خوابوں کے ہمسائے کا متبادل بن جاتے ہیں۔ زمانۂ جدیدیت میں قنوطیت پسندی کے رجحان کو اپنانے والے شعرا کے یہاں انحراف کی لے اتنی مستحکم اس لئے نہیں ہوسکی کہ یہ اسمگل کی ہوئی تحریک یا رُجحان کی لہر میں خس و خاشاک کی طرح بہت پہلے بہہ چکے تھے جن لوگوں نے طوفان کے ٹھہرنے کا انتظار کیا ان میں شاہد جمیل بھی تھے۔ میرا مشاہدہ ہے کہ میرے چاروں معاصرین شاہد جمیل، شاہد کلیم، عین تابش اور شمیم قاسمی جدیدیت کے اس عبوری دور کی پیداوار ہیں جہاں سبھوں نے اپنے نام نہاد پیش رووں کو بھٹکتے ہوئے قریب سے دیکھا ہے۔ یہ بھٹکاؤ تقلیدی شاعری کو اوڑھ لینے کے باوصف مستحسن قرار دینے والوں میں بھی تھا لیکن ایسے ناقد شعرا نے پھر بڑی چالاکی سے اپنی راہ الگ کرلی۔ آج جبکہ کم و بیش تیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے

(بشمول میرے) ہم پانچ سواروں میں کسی طرح کی سیاسی سبقت لے جانے کی ہوڑ مکروہ ڈھنگ سے اس لئے نہیں ہے کہ سبھوں نے جدیدیت کے بگڑتے اور بنتے ہوئے خدّ وخال کو کھلی نگاہوں سے دیکھا ہے بلکہ چھان پھٹک کر نتیجہ برآمد بھی کر لیا ہے۔ شاہد جمیل کی فکر کا DIMENSION خوابناک غموں کی پذیرائی اور اس میں مانع خدشات سے پیدا شدہ بحران کو سمیٹنے کی غرض وغایت سے جڑا ہے۔ اکثر یہ لفظ ومعنی کے بیچ پل یا ثالث وشاہد نہیں رہتے بلکہ واقعات وسانحات کے اثرات کو محفوظ طریقے سے حلولِ جسم وجاں کرتے نظر آتے ہیں۔

خواب کی درجہ بندی اگر کی جائے تو عموماً تین طرح کے خواب آنکھوں کے دریچے سے جھانکتے ہیں (۱) خوش خواب (۲) بدخوابی (۳) بے خواب۔ خوش خوابی انسان کی فطری خواہش ہے۔ خوابوں کے سہارے بہلنا اور تشریحات کے بموجب عملاً مطابقت ڈھونڈنا اور پھر محرومی سے دوچار ہونا ہی اس نوع کے خواب کا تسلسل ارتقاء اور انجام ہے۔ بدخوابی کا اجمالاً جائزہ اس طرح بھی ممکن ہے کہ کھلی نگاہوں سے دیکھے گئے خواب (مشاہدے) جب اپنے کریہہ چہرے کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں تو حیرانی اور اضطراب کی ٹوٹی ہوئی کرچیں جابجا بکھرتی ہوئی ملتی ہیں۔ اس میں ملوے ہی نہیں شعور کی آنکھ کا رنگ بھی خوں چکاں ہو جاتا ہے۔ بے خوابی یعنی آنکھوں کا تہہِ خواب ہونا ناامیدی کے PATHOS کا وہ ایورسٹ ہے جہاں خوابوں کی سرخروئی کا پرچم لہرانا کارِ دشوار ہی نہیں، امرِ محال بھی ہے۔ شاہد جمیل کے "خوابوں کے ہمسائے" میں متذکرہ تینوں نوعیتوں کے خوابوں کی المناکی کی داستان ہر مصرع۔ ہر شعر میں تہہ داری کے ساتھ موجود ہے۔ "خوابوں کے ہمسائے" شاہد جمیل کی منتخب نظم کا ایک عنوان ہے، اس میں خوابوں کے چہرے کی شناخت ذیل کے مصرعوں میں اس طرح کی گئی ہے ؎

ہم جیسے آوارہ لوگ
خوابوں کے ہمسائے ہیں
خوابوں ہی کی باتیں ہیں
خوابوں کی سب گھاتیں ہیں
خواب ہی اپنے بادل ہیں
خواب ہی اپنے شہر ہیں
خوابوں کی ہر خوشبو ہے
خوابوں کا سب جادو ہے!

اس نظم میں واحد متکلم خود شاعر ہے جہاں فریق ثانی سے یہ کہہ کر خوابوں کے وجود کا تحفظ کرتا ہے کہ تم جو ایک حقیقت ہو۔ تم کو ہم سے کیا مطلب ہے، شاعر کا سوالیہ تخاطب پوری نظم میں اس طرح اثر انداز ہوا ہے کہ خوابوں کی سچائی کو آنکھوں سے باندھنے کا فن بڑی مشاقی سے اُجاگر ہو گیا ہے۔

اس سفر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر خواب نقشِ قدم کے ساتھ روشن ہے۔ شاعر کا تجسس پھر یہیں ختم نہیں ہو جاتا ہے بلکہ خواب کو خود اس کی منزل قرار دینے کا جواز مستحکم بھی پیش کر دیتا ہے۔ کتاب کے اخیر میں ایک نظم جس کا عنوان "زاویوں کے درمیان" ہے، شاعر کہتا ہے ؎

سنا ہے کہ کوئی حقیقت / مرے خواب زادوں سے ملنے / مرے خواب ریزوں کو چننے / مرے موسموں میں مرے ساتھ کھلنے، مچلنے / مری سانس بننے کو تیار ہے۔

شاہد جمیل نے خوابوں کی دنیا کو نہ صرف دیدۂ بینا سے دیکھا ہے بلکہ چشمِ تصور میں خواب کی ایک ایسی عمارت بھی تعمیر کر دی ہے جس کے منہدم ہونے کا شائبہ تک نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تخلیق کار کے خواب زادوں سے ملنے، اس کے خواب ریزوں کو چننے اور سانس بننے کے لئے تیار رہنے کی بشارت بھی حقیقت کی دنیا دے چکی ہے۔ شاہد جمیل کی تیسری نظم جس کا عنوان "خواب زادوں کے سائے سائے" ہے اس میں شاعر کا روئے سخن براہِ راست اور مکالماتی ہو گیا ہے۔ خواب کا بوجھل حقیقتوں کے ریگزار میں گم ہونا، فاصلوں کے باوجود

شاداب موسموں کے شباب سے دور ہم زباں ہونا اور پھر اسے چھونے کے احساس کو سچ قرار دینا، ایک ایسا خوش آئند اقرار نامہ ہے۔ جس میں شاعر کی نو آباد خوابوں کی دنیا مترشح ہوتی چلی جاتی ہے، شاہد جمیل کی دوسری نظموں میں خوابوں کی پرچھائیاں ذہن کی دیوار پر رینگتی ہوئی نظر آتی ہیں جنہیں احساس کی انگلی سے چھو کر خوشگوار ذائقہ کا لمس حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اب ذرا ہم "خوابوں کے ہمسائے" کی غزلوں کی طرف مڑ کے دیکھتے ہیں۔ شاہد جمیل خوابوں کی جلوہ گری کو عام کرتے ہوئے مسحور کن حالات سے گزرنے کا شعری عمل اس طرح پیش کرتے ہیں۔

ایک ہی خواب تو موتی کی طرح آنکھ میں تھا
خاکِ دل! تو ہی بتا! اس کا بھی کیا ہم نے کیا

پلکوں پہ کوئی نیند ہوگی نہ آنکھوں میں کوئی خواب
موسم کبھی کبھار کچھ ایسے بھی آئیں گے

میں جن کو ڈھونڈ رہا تھا شبِ عتاب کے پاس
کھڑے ہوئے تھے وہ آنکھوں میں میری خواب کے پاس

مرے رتجگوں کو ظفریاب کر دے
خدایا! اسے آشنائے خواب کر دے

لہو لہو سا یہ چہرہ گلاب دیکھوں گا
ترا وجود ہے ریشم تو خواب دیکھوں گا

لبِ سراب بے زاری، چشم خواب سے عاری
کس قدر ادھورے ہیں، یہ سجے سجے چہرے

محولہ چھ اشعار میں خواب کے وجود اور اس کی ہمسائیگی کو شاعر نے الگ الگ خانوں میں تقسیم کرتے ہوئے ان کی بے بضاعتی اور ان سے حاصل شدہ نتائج کو خاکِ دل کی طرح بکھرنے، اس کے بکھرنے کا جواز دیدۂ حیراں کیلئے لطف کا سامان پیدا کرتے ہیں۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ شاہد جمیل کے خوابناک احساسات پر چشم تصور بہ آسانی نہیں کھلتی بلکہ منفی بشارت کی المناکی پلکوں پہ نیند اور آنکھوں کی خوابوں سے محرومی کے ذریعہ خوش فہمیوں کے کھیل کا تدارک کرتی ہے۔ آنکھوں کے پاس خواب کا کھڑا ہونا، اور غلط فہمی میں اسے شب عتاب کے پاس ڈھونڈنا، پھر رتجگوں کی فتح یابی کے لئے شاعر کا بے خوابی کی سطح پر ملتجی ہونا کس صلۂ رحمی کی داد ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے شاہد جمیل کی بھرپور شعری ذکاوت سے حاصل کئے بغیر تفہیم لا حاصل ہے۔ آنکھ، لب، چہرے جو کہ شناخت کی شرطِ اولین ہیں اسے بے زاری کا سراب قرار دیتے ہوئے تہی خواب ہونے کی حقیقت کو ادھورے چہرے کہہ کر جھٹلانے سے تعبیر کرنا منفرد سلیقہ مندی ہے۔

خوابوں کے حوالے اور محولہ اشعار کے تجزیے سے الگ شاہد جمیل کی خوش رنگ کیفیات دوسری غزلوں میں بہ آسانی تلاش کی جا سکتی ہیں جہاں ہر جگہ شاہد جمیل اپنی زود حسی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ شعری مجموعے کی ابتدا نعت شریف سے ہوتی ہے خالقِ کائنات کے خصوصی نور (حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم) سے امید کے جگنو حاصل کر کے اپنی زندگی کی راہوں کو منور کرنے کی تمنا شاعر کی خوش اعتقادی پر دال ہے۔

شاہد جمیل کی شاعری کے متعلق محمود ہاشمی نے جزوی طور پر صحیح کہا ہے کہ ان کے شعر میں انفرادی ذائقہ ہے۔ ذائقے کی بات آگئی تو کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شاہد جمیل کی غزلوں کا استعاراتی نظام اپنے معاصرین میں بھی منفرد ہونے کی وجہ سے کشش کا باعث رہا ہے رسائل و جرائد، ریڈیو میں ان کے کلام کی نشر و اشاعت سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہ مقدار کی پروا کئے بغیر اپنی توجہ کا مرکز معیار کو ٹھہراتے ہیں۔ ذات و کائنات کے وسیلے سے اپنی موجودگی کا احساس ہر شعر میں کرانا، پھر بدلتے گم ہوتے لمحے کی روپوشی سے تحیر خیزی کا برملا اظہار کرنا شاہد جمیل کے شعری عمل کا نمایاں وصف ہے ذیل کے اشعار میں شاہد جمیل نے تجربے اور مشاہدے سے اپنی

شعری کائنات کی مخصوص فضا خلق کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

وقت کی دھوپ تپش لاکھ اگائے دل پر
ایک گوشے میں مگر تھوڑی تری رہتی ہے

دل وہ پتھر ہے جو ہر موج سہا کرتا ہے
غم وہ ندی ہے جو ہر وقت بھری رہتی ہے

وقت کی دھوپ کا تپش اگانا، دل کو پتھر قرار دیتے ہوئے موج سہنے کا دکھ بیان کرنا غم کی ندی کا ہر وقت بھرا رہنا وغیرہم شاہدے عام نہیں بلکہ خواص کے زمرے میں آتے ہیں۔ شاہد جمیل کی غزلوں میں بےزاری اور اکتاہٹ کا بھی بر ملا اظہار دیکھنے کو ملتا ہے۔

وہ خوش نصیب تھے، اک دوسرے کے دشمن تھے
مرا مقابلہ ہر موڑ پہ مجھی سے تھا

تمہاری دی ہوئی اکتاہٹوں کا کیا کہنا!
میں رات کھل کے بغل گیر زندگی سے تھا!

چھوٹی عمر میں "خوابوں کے ہمسائے" کے خالق نے بڑے خوشبو دار پھول کھلائے ہیں ؎

اک دریا رواں نہیں ملتا
ورنہ ساحل کہاں نہیں ملتا

صرف غم کی زمین ہوتی ہے
ہجر میں آسمان نہیں ملتا

ہجرت کی المناکی کے شکار لوگ اپنے سر اور کاندھے پر مفقود آسمان اور گھر کے بوجھ ڈھونے کا نوحہ بیان کرتے ہیں لیکن شاہد جمیل کی ارضیت پسندی نے شعر کی جہت ہی بدل دی ہے جس کی وجہ سے منفرد شعر خلق ہوا ہے۔ آنکھ آنسو، لب اور غم کے انسلاک سے شاہد جمیل نے کس نازکی سے شعریت پیدا کی ہے اسے محسوس کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا ؎

ہونٹوں سے مسکراتے ہوئے غم کو کیا پتہ؟
آنکھوں نے آنسوؤں کو سنبھالا ہے کس طرح

قربِ باہم کی دلکشی اور اس کے منفی نتیجے سے حاصل تلخی کو شاہد جمیل نے یوں شعری زبان عطا کی ہے۔

گھٹن کے نام پہ کچھ قربتیں بچائے رکھو
جو آنے والا ہے موسم بہت کھلا ہوگا

نئی غزل میں شعر کے حوالے سے مصوری کرنے والوں میں شاہد جمیل کا نام منفرد و ممتاز ہے۔ ذیل کے اشعار میرے اس دعوے کا بیّن ثبوت ہیں۔

پانی میں وہاں نشہ سا کچھ تھا
دو دھارے جہاں پہ مل رہے تھے

شفاف گہرے جو صدف تھے
ملبوسِ غبار و گِل رہے تھے

میں آنے والی بہاروں میں کتنا شامل تھا
جو زرد پتے تھے ان پر مرا بچھونا تھا

شاہد جمیل کا ذاتی غم جب کائناتی ہو جاتا ہے تو ان کی سماجی بصیرت پر داد دینے کو جی چاہتا ہے ؎

ہر کسے قہقہے میں دکھوں کی کشتی
ہر ہتھیلی میں سمندر کوئی

معاملاتِ زندگی میں پانے اور کھونے کا غم اہم موضوع بن کر جدید غزل میں بکھرتا رہا ہے۔ یہاں بھی شاہد جمیل تجربے کی چھاپ چھوڑ جاتے ہیں ؎

اس سے چھوٹا تو اسے پانے کا عرفان ہوا
میں سمجھتا تھا، بچھڑ کر مجھے نقصان ہوا

اک تیرے تعلق میں اترنے کا صلہ تھا
چہرے پہ مرے کون سا چہرہ نہیں ابھرا

یہ کبھی ہوتا ہے کہ چہرہ ہی بدل جاتا ہے

آئینہ چہرے سے بے زار نہیں ہو سکتا

محولہ اشعار کے علاوہ کبھی فرد کی نفسیات کی گرہ کھولتے ہوئے متعدد ایسے اشعار شاہد جمیل نے کہے ہیں جس سے ان کی ذہنی وابستگی اور حسن سلوک کے علاقے کا پتہ چلتا ہے۔ جیسے جیسے سن میں پختگی آتی ہے تجربات اور مشاہدے میں دروں بینی کا عمل پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اپنی ذات سے کائنات تک بکھرے ہوئے تلخ و ترش، سیاہ و سفید، خارج و داخل زمان و مکان اور مرئی و غیر مرئی اشیاء کے مابین شاعر شعور کی آنکھ سے دیکھتے ہوئے ان کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شاہد جمیل نے بھی ان تمام شرائط کی تکمیل انتہائی فنکارانہ ڈھنگ سے کی ہے اور کہیں سے باسی پن، مستعار دکھوں کی واجبی ترسیل کا سوانگ رچانے کی کیفیت نہیں ملتی ہے۔ اردو میں بارہ ماسے کی روایت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ہندی مہینے میں ساون سے جیٹھ کی موسمی کیفیت جسمانی تلذذ اور مناظر قدرت کی عکاسی کرتے ہوئے نیچر کو خراج پیش کیا جاتا رہا ہے لیکن شاہد جمیل نے جنوری سے دسمبر تک کو بالکل نئے اور جدید ڈھنگ سے اس سلیقے سے برتا ہے کہ شاعر کی سوچ کی انفرادی لہر بہت دور تک اٹھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ جنوری کے حوالہ سے دسمبر کی تلاش کا شاعرانہ اظہار دامنِ دل کو کھینچتا ہے ؎

دل دسمبر سا کہیں کھویا ہوا

شہر کی آنکھوں سے ظاہر جنوری

غم دسمبر کی کتاب اوّلیں

اور خوشی کا حرف آخر جنوری

اس طرح جنوری کی بند دیواروں میں فروری کا کھڑکی کھولنا، دھوپ کا نامحرم ہونا، دروازے پر مارچ کا پردہ ہونا، لُو سمندر، جس کو کشتی سے تعبیر کرتے ہوئے اپریل کو بادباں کہنا، مئی کے ہر قدم پر دسمبر کے نزول کا دھیان رکھنا، جون کو دل کے حالات کا زائچہ کہنا، ساغروں میں آگ بھرتی ہوئی جولائی کا اظہار کرنا، دل کی شاخ کو زرد ملتے ہوئے اگست کو شاداب کہنا، آنکھ، منظر، رنگ، خوشبو کے حوالے سے ستمبر کو پیار کا پرچم کہنا، ناکام اکتوبر کو درد کا دسواں حصہ کہنا، بھاگل پور کے فساد کے پس منظر میں نومبر مہینے کا نہانا، دسمبر کا چھوٹے بچوں کی طرح دوڑنا جیسی کیفیات کو مشاہدے کی آنکھ سے دیکھنے کا انفرادی ذائقہ شاہد جمیل نے جس نوع سے پیش کیا ہے۔ نئی غزلیہ شاعری میں مجھے اب تک دیکھنے کو نہیں ملا۔

محولہ تمام نظموں، غزلوں کے مطالعہ کی روشنی میں، میں ایسے نتیجے پر پہونچا ہوں کہ شاہد جمیل کی فکری و فنی بلندی اپنے معاصرین میں نمایاں ہے۔ میرا پختہ ایمان ہے کہ اپنی زود حسی کی بدولت نئی غزل کے اہم معماروں اور صالح جدیدیت کے علم برداروں میں شاہد جمیل کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ●

سید احمد قادری
ایڈیٹر بودھ دھرتی، نیوکریم گنج، گیا

شاہد جمیل: خوابوں کا شاعر

شاہد جمیل، گذشتہ دو دہائیوں سے اردو شاعری کی تپتی ریت پر سفر کر رہے ہیں اور ان کا یہ سفر جاری و ساری ہے۔ ان دو دہائیوں کے سفر میں شاہد جمیل نے نہ جانے کتنے وقت کے بدلتے تیور، حالات کی سنگینیوں اور حالات کے تصادم کو دیکھا اور شدت سے محسوس کیا ہے۔

اس دوران شاعری بھی کئی تجرباتی دور سے گذری اور اس کے اسلوب اور تجربات میں نہ صرف نمایاں تبدیلی آئی، بلکہ اس کے تفکرات اور تصورات بھی بدلے۔

پوری دو دہائی تک اپنے فکر و فن سے شاعری کو سجاتے سنوارتے رہنا اور اپنے اسلوب کی ندرت، موضوعات کے تنوع اور احساسات و جذبات کی گہرائی و گیرائی کو نمایاں اور منفرد بنانے کی کوشش ہی شاہد جمیل کی شاعرانہ عظمت کی دلیل ہے۔ ورنہ ہمارے بعض شاعر عہد طفلی میں ہی اتنے بلند بانگ دعوے پیش کرنے لگتے ہیں کہ ان کے سامنے پوری شاعری ہی بے معنی نظر آنے لگتی ہے۔ ایسے عمل اور بیان سے شاہد جمیل نے گریز کرتے ہوئے، بڑے اعتماد اور حوصلہ کے ساتھ ایسے ایسے خوبصورت اور فکر و فلسفہ سے معمور اشعار پیش کئے، کہ لوگ چونک پڑے اور یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

> "شاہد جمیل جدید تر نسل کے تازہ کار رویے اور طرز فکر کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کا مجموعہ "خوابوں کے ہم سائے" پڑھنے والوں کو چونکائے گا اور دیر تک سوچنے اور محسوس کرتے رہنے پر مجبور کرے گا۔"

محمود ہاشمی کی یہ رائے شاہد جمیل کے ان اشعار کی روشنی میں سامنے آئی جو فکری، فنی اور موضوعات و مواد کے لحاظ سے بڑے مؤثر اور مستحکم انداز میں پیش ہوئے۔ مثلاً یہ اشعار ؎

میرے سر سے جو بھی گذرا سانحہ کچھ بھی نہ تھا
یا زمانے سے ابھی میں آشنا کچھ بھی نہ تھا

میں آنے والی بہاروں میں کتنا شامل تھا!
جو زرد پتے تھے، ان پر مرا بھی نام تھا

انا کی جنگ، خرد کا کھنڈر، جنوں کے چراغ
میں اس محاذ پہ سب کچھ لٹانے والا ہوں

دل وہ پتھر ہے جو ہر موج سہا کرتا ہے
غم وہ ندی ہے جو ہر وقت بھری رہتی ہے

کبھی ہنسی، کبھی آنسو، کبھی غبار ہوں میں
مجھے کھنگالو کہ جذبوں کا ریگ زار ہوں میں

یہ تمام اشعار اس امر کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ شاہد جمیل نے حیات و کائنات کے اسرار و رموز کا بغور مطالعہ و مشاہدہ کیا ہے، جن کا اظہار، اپنے مخصوص لب و لہجہ میں، داخلی و خارجی کرب اور احساسات و جذبات

کے ساتھ پیش کر کے فکر و فن کو اعلیٰ مقام عطا کرتے ہیں۔

شاہد جمیل جس وقت اردو شاعری میں متعارف ہوئے اس وقت ترقی پسند تحریک کا سیلاب تھم چکا تھا اور جدیدیت شباب پر تھی اور نئے تجربات کے نام پر ایسے ایسے نمونے سامنے آئے اور ؎

مزاجِ حسن ہے ظاہر میں ٹھنڈا
سلگتا ہے مگر بھوبھل میں انڈا!

(سلیم احمد)

جیسی شاعری نے اردو شاعری کے حسن و معنویت کو نہ صرف مجروح اور مسخ کیا بلکہ اسکی افہام و تفہیم بھی مسئلہ بنی جس سے اس کی مقبولیت ختم ہونے لگی۔ کہا جاتا ہے کہ شاعری اپنے زمانے اور عہد کا آئینہ ہوتی ہے، لیکن تقلیدی اور نام نہاد جدیدیت نے اردو شاعری کو اپنے عہد، سماج، زمانہ اور اجتماعیت سے دور کر کے انفرادی خول میں سمیٹ کر اسے صرف ذاتی کرب، گھٹن اور خوف تک محدود کر دیا اور شعوری طور پر علامتوں، استعاروں اور تشبیہوں کے سہارے گنجلک اور لایعنی بنا دیا۔ اس حد تک کہ جو شاعری جتنی مبہم اور فہم و ادراک سے دور ہو، اتنی ہی کامیاب قرار دی جانے لگی۔ ایسی کوششوں سے اردو شاعری پر گہن لگنا فطری تھا، لیکن نئی نسل کے بعد تازہ دم شعراء کی فکری و فنی کاوشوں سے آہستہ آہستہ گہن ختم ہونے لگا اور پھر دھیرے دھیرے یہ خوشگوار تبدیلی جن نوجوان شعراء کی وجہ کر ممکن ہو سکی، ان میں شاہد جمیل کا نام کئی لحاظ سے ہے جو معتبر اور اہم ہے۔ شاہد جمیل نے اپنے تجربات اور محسوسات کو ایک خاص زاویۂ نگاہ کے ساتھ اپنی پوری توانائی، اعتماد اور وقار کے ساتھ پیش کرنے کی جسارت اس انداز سے کی ہے ؎

دھواں، غبار، لہو، پیاس کچھ تو لیتے جاؤ
ہمارے شہر سے لوٹو گے اور خالی ہاتھ!

میں تو شاعر ہوں، مرا کام جھلتے رہنا
اوس کی بوند ترا نام سہی، یاد نہ آ

اب تم کو یہاں کوئی بھی آواز نہ دے گا
ہر شخص تمہاری ہی طرح ٹوٹ چکا ہے

تم ویسے کبھی ڈرنے سے رہا کرتے ہو شاہد
باہر نہ ابھی نکلو بہت تیز ہوا ہے

ایسے خوبصورت اور بامعنی اشعار شاہد جمیل نے کہہ کر یقیناً شعری دنیا کو چونکایا ہے، جس کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے بدر اورنگ آبادی لکھتے ہیں

"گذشتہ چند برسوں میں جن شعراء نے شعری دنیا کو چونکایا ہے، ان میں شاہد جمیل کا نام نمایاں ہے۔ نظم و غزل، دونوں اصناف میں معنویت کی گہرائی، اندازِ بیان کا انوکھا رنگ، الفاظ کے صوتیاتی حسن اور موضوع کا پورا منظر نامہ یکساں طور پر نظر آتا ہے۔ اس لئے یہ فیصلہ کرنے میں کوئی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی کہ شاہد جمیل بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے یا نظم کا۔"

(زبان و ادب، پٹنہ)

یہ حقیقت ہے کہ شاہد جمیل جس عہد میں سانس لے رہے ہیں، ان میں بارود اور جلتے ہوئے انسانی جسم کی بو ہر چہار طرف فضا میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور چونکہ زندہ رہنے کے لئے سانس لینا ضروری ہے، اس لئے فضا میں رچی بسی اس بو کو بھی شاہد جمیل اپنے اندر جذب کر لینے پر مجبور ہیں اور اس کے بعد ان کا داخلی درد و کرب اس طرح سامنے آتا ہے کہ ان کا ایک ایک شعر تخلیقیت اور معنویت کا نمونہ قرار پاتا ہے ؎

حادثے یوں نہ متحد ہوتے
یہ سفر قسط وار کرنا تھا

غم سے بے لاگ جو مسرور رہا برسوں تلک
زندگی آج وہی پھول سا چہرہ مانگے

زندگی کے موسم کو ڈھونڈتے نہیں سڑکوں پر
خود سے بے خبر سے ہیں کچھ نئے نئے چہرے

ہر چہرہ سلگتے ہوئے قطروں میں بٹا ہے
ہم سب کو سمندر سا کوئی لوٹ رہا ہے

زندگی کی المناکیوں، کرب، گھٹن اور درد میں ڈوبی صدا یقیناً آج کے بیمار عہد کا اشاریہ ہیں، جن سے ہر شخص نبرد آزما ہے۔ شاہد جمیل ایک حساس شاعر ہیں، اس لئے انہوں نے اپنی ان کیفیتوں کو بڑے واضح اور منفرد انداز کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ایسے شعری اظہار سے متاثر ہو کر شمس الرحمن فاروقی بھی یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ :-

"آپ کا کلام عمدہ ہے۔ اس میں ایک وقار تفکر اور ٹھہراؤ ہے، جو آپ جیسے کم عمر شاعر کے لئے لائق افتخار ہے۔"

کچھ اسی انداز سے گوپی چند نارنگ بھی شاہد جمیل کی شعری عظمت کا اعتراف کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں :-

"آپ کی تازگی فکر اور تراش کا قائل ہوں۔"

جدید تر نسل کے کسی شاعر کے لئے ایسا تنقیدی اظہار ایک اعزاز ہے، اور اس کی عظمت کی دلیل ہے۔ ورنہ ان دنوں جس طرح کی شاعری سامنے آرہی ہے، انھیں دیکھ کر مایوسیوں کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے کہ عہد جدید کے زیادہ تر شاعر کا مطالعہ و مشاہدہ محدود اور فکر و خیال میں وہ بلندی نہیں جو شاعری کو با مراد اور با وقار بناتی ہے۔

شاہد جمیل کی شاعری اس لحاظ سے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اپنے ہم عصر شعرا کے درمیان انہوں نے اپنی منفرد پہچان بنائی ہے اور لوگوں کے ذہن پر یہ احساس مرتسم کرنے میں کامیاب ہیں کہ ان کی شاعری سلگتے ہوئے خوابوں کی عبارتوں کی ترجمان ہے اور حیات و کائنات کا بیان بھی۔ ہر حساس شاعر کی طرح وہ بھی خوابوں کو سجاتے اور سنوارتے ہیں۔ ان خوابوں میں کبھی کونپلیں پھوٹتی دکھائی دیتی ہیں اور کبھی وہ انہیں جھلستے ہوئے بھی دیکھتے ہیں۔ ایسے خوابوں سے وہ متفکر بھی ہوتے ہیں اور ہراساں بھی۔ وہ خوشی و انبساط کی کیفیتوں سے سرشار بھی ہوتے ہیں اور روشن جگنوؤں اور رنگ برنگی تتلیوں کو پکڑنے کی بھی کوشش کرتے ہیں، جو دراصل مسرت و محبت اور حسن و عشق کی علامتیں بن کر جلوہ گر ہوتی ہیں، جنھیں اپنے گہرے تنقیدی شعور، تخلیقی بصیرت، فکری و فنی آگہی کو اپنے مخصوص لب و لہجہ اور اسلوب کے ساتھ شعری پیکر میں ڈھال کر نہ صرف اپنے عہد کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں، بلکہ آنے والے لمحوں کی آہٹ کی بھی نشاندہی کرتے ہیں ؎

لب سراب بے زاری، چشم خواب سے عاری
کس قدر ادھورے ہیں یہ سجے سجے چہرے

میں اک رات ہر رات بے خواب
تو اک خواب ہر دم سنہرا

سفید خواب، خواب کی سحر سفید
دھنک ہوئی سیاہ بحر و بر سفید

ایسے خواب اور خواب کی تعبیر کو دیکھنے، سمجھنے اور سمجھانے والا شاعر زندگی اور اس کی حقیقتوں کا کس قدر نباض ہے، اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس سیاق و سباق میں بلراج کومل کی یہ رائے بڑی اہمیت کی حامل ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"عہد بیمار کے شکوہ گذار ہونے کے باوجود شاہد جمیل خوابوں کے بحران خوابوں کی تلاش، یادوں کی رعنائی، سمندر کی زرخیز لیکن گمشدہ آوارگی، واضح اور غیر واضح رشتوں کی وابستگی، مائل اضطراب اور متکلم پر خطر گوشہ نشینی کا ایک ایسا منظر نامہ پیش کرتے ہیں جس میں بیک وقت کئی غیر محفوظ، متضاد، متصادم عناصر سرگرم عمل رہیں۔

نظم اور غزل دونوں اصناف میں انتخاب موضوعات و الفاظ، مصرعوں کی نشست و برخاست، لب و لہجے کی تازگی اور ندرت، قافیے کے فنکارانہ استعمال کی سحر کاری ان کے کلام کی امتیازی خصوصیات میں سے چند قابل ذکر خصوصیات ہیں۔ (بقیہ ص ۱۴۳ پر)

ڈاکٹر مظفر حسن عالی
بارہ دری، سہسرام (بہار)

شاہد جمیل کا انفرادی ذہن

شاہد جمیل نے اپنے اولین شعری مجموعے "خوابوں کے ہمسائے" میں اس بات کی طرف واضح اشارہ کیا ہے کہ اس نے اپنے ادبی سفر کا باقاعدہ آغاز ۱۹۶۹ء سے کیا۔ راقم جب اس کے مجموعے کو ترتیب دے رہا تھا، راقم کی نظر اس وقت اس بات پر نہ گئی کہ اس مجموعے میں ۱۹۷۳ء سے ۱۹۹۱ء تک کی ہی چیزیں شامل ہیں اور چار سال کی محنتوں اور ان چار برسوں سے پہلے کی مشق و ریاضت کو مجموعے سے دور رکھا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر ۶۹ء سے پہلے کے چند برسوں میں اپنا محاورہ تلاش کرنے میں محو و مگن اور سرگرداں تھا۔

مجھے یاد ہے کہ ۷۰ء میں ہم دونوں سہسرام ہائی اسکول میں گیارہویں جماعت کے طالب علم تھے وہ کلاس میں جب شعر سنایا کرتا تھا تو اس وقت اس کی کم عمری اور طفل مکتبی اس کی شاعرانہ صلاحیت کی تکذیب کرتی تھیں۔ اور اس کا قد سخن گفتنی کے مقابل کوتاہ معلوم ہوتا تھا اور یقین نہیں آتا تھا کہ یہ اشعار اسی نوعمر لڑکے نے کہے ہیں۔ تاہم اپنی شعر فہمی کا معاملہ بھی بس یونہی سا تھا۔ پھر بھی اس کا تازہ کار لہجہ اور موزونیت مزہ دے جاتی تھی۔ کالج پہنچنے تک اس کی آواز میں قدرے سنجیدگی کا احساس ہونے لگا تھا۔

شاہد جمیل کی سرشت میں ایک بے چین لاابالی پن تھا۔ پرانی غزلوں سے نامطمئن، نئے کی تلاش میں بے چین، کبھی فیض و فراق کے دواوین کا مطالعہ کرتا۔ کبھی جذبی و مجاز کو گلے لگاتا۔ اس کے سامنے شاعری کے کئی آسمان تھے جن کی بلندیوں کو ہاتھوں سے نہیں، ہونٹوں سے چوم لینا چاہتا تھا۔ غالب اور اقبال اس کے پسندیدہ شاعر تھے۔ خود اس کے اپنے شہر (سہسرام) میں جہاں ایک طرف کلاسیکی شاعری کا پختہ غزل گو شاعر مانوس سہسرامی موجود تھا تو دوسری طرف مانوس کا شاگرد سلطان اختر شیر شاہ کی نگری میں جدید شاعری کی شمع روشن کئے ہوئے تھا۔ دوسری طرف باقی، منظر امام، ندا فاضلی، ساقی فاروقی کے "شعر شور انگیز" اس کی روح کو بے کراں عطا کر رہے تھے۔ تاہم اس کی سرشت میں تتبع اور پیروی کا احساس خال خال تھا۔ وہ کسی کرائے کے خیالی گھوڑے پر سفر کرنا اپنی عار سمجھتا تھا۔ اس لئے اس نے بنے بنائے راستے پر چلنا گوارہ نہیں کیا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ تمام راستے جو بنے بنائے تھے ان کی منزلوں کو اس نے دریافت ضرور کر لیا تھا اور اسی احساس دریافت نے نئی سمت کی اور اڑان کے لئے نئے حوصلے اور نئے بال و پر عطا کئے۔ اس نے جس تیز رفتاری اور زود گفتاری سے کام لیا، یہ اس کی صلاحیت اور کرشمہ سازی ہی کہی جائے گی۔ اس کی خود

اعتمادی، لہجے کی تازگی، توانائی اور پرکار تخیل کی رنگین سیماب پائی نے اسے جدید تر شاعر بنادیا۔

فی الوقت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ میں اپنے بیان میں کہاں تک حق بجانب ہوں، تاہم اس صداقت کا اعتراف واظہار اس کے اشعار کے مطالعے سے بخوبی ہوسکتا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ اس نے اپنے پرکار تخیل سے بہت جلد لوگوں کو اپنی طرف راغب کرلیا اور وہ ایسے شاعر کی حیثیت سے دنیائے شاعری کے افق پر نمودار ہوا، جسے اپنے ذہن و شعور اور زبان وذات پر پورا بھروسہ تھا۔ اسی لئے محمود ہاشمی نے "خوابوں کے ہم سائے" پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "شاہد جمیل کی شاعری میں بانی کے شعر جیسا انفرادی ذائقہ ہے اور شاہد جمیل جدید تر نسل کے تازہ کار ردیئے اور طرز فکر کے نمائندہ شاعر ہیں"۔ ہر اچھی شاعری اچھا شعور عطا کرتی ہے۔ اور اچھے اور سچے فن کار کے فکر وفن کو جلا بخشتی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ "خوابوں کے ہم سائے" اپنے پڑھنے والوں کو چونکا گیا ہے اور چونکا رہا ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ دیر تک سوچنے اور محسوس کرتے رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔

شاہد جمیل نے خود کو ہجوم سے الگ ضرور رکھا، مگر وہ مردم بیزار بھی نہیں کہ لوگ اس کے قریب جانا پسند نہ کریں۔ نہ اس نے بے جا واہ واہی چاہی، نہ کج کلاہی اختیار کی بلکہ وہ دوستی کا رسیا اور دوستوں کا دلدادہ ہے اگر کوئی ایک بار اس سے ملتا ہے تو بار بار ملنے کی خواہش ظاہر کرتا ہے اس کی ہنسی، اس کی گفتگو کا انداز دلبرانہ اس سے بار بار ملنے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں اپنی تمام تر ذہانت وفطانت اور شرافت ومتانت کے باوجود نہایت سادہ اور ملنسار واقع ہوا ہے۔ اس نے تنہا قدم بڑھانے کے حوصلے کو اپنا ہم سفر ضرور بنایا۔ یہی سبب ہے کہ اس کی فکری جولانی اور جودت طبع نے اسے تعقل کی کھلی فضا میں سانس لینے کا عادی بنادیا۔

شاہد جمیل کے مزاج میں خودداری بھی ہے اور بلا کا استغنا بھی، جمالیات کا دلدادہ، ہر اچھی چیز پہ فدا۔ مگر اس کا شاعرانہ مزاج محبت کے رومانی جذبات سے بڑی حد تک پہلو تہی کرتا ہے۔ جدید تر شاعری کا یہ علم بردار شاعر جسم وجمال کے تذکروں سے صرف نظر تو کرتا ہے، مگر کبیدہ روگردانی نہیں کرتا۔ کسی کو مڑ کر دیکھ لینے کی حس تو موجود ہے مگر بڑھ کر چھو لینے کا الزام اس سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی جذباتیت میں ضبط وتحمل اور ٹھہراؤ کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ انہیں جذبہ واحساسات کا فکری وفنی بانکپن اس کی شاعری کو وزن ووقار بخشتا ہے۔

شاہد جمیل نے اپنی خلاقانہ قوتوں اور شعری صلاحیتوں کو دھیرے دھیرے صیقل کیا ہے اور ریاضت فن کی بجائے مہارت فن سے زیادہ کام لے کر اپنے آئینہ شاعری کو منور کرتا رہا ہے۔ تب کہیں جاکر "خوابوں کے ہم سائے" کی تجسیم کا عمل مکمل ہوسکا ہے۔

یہاں فی الوقت یہ کہنا، قبل از وقت ہوگا کہ شاہد جمیل کے شاعرانہ جوہر غزلوں میں زیادہ روشن ہوئے ہیں یا نظموں میں، اس لئے کہ جب میں اس کی غزلوں کا مطالعہ کرتا ہوں تو لگتا ہے کہ اس کی شخصیت اس صنف میں زیادہ نکھری معلوم ہوتی ہے، اور جب اس کی نظموں کو پڑھتا ہوں تو لگتا ہے کہ اس کی شخصیت کا اظہار غزلوں کی بجائے نظموں میں زیادہ واضح اور صاف ہے۔ تاہم اس کے فکری وفنی رجحان میں جو تخلیقی جراثیم پائے جاتے ہیں، ان کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ یقیناً آگے چل کر نظموں میں زیادہ کامیاب ہوگا۔

آیئے یہاں ہم اس کی کچھ غزلوں پر نگاہ ڈالتے چلیں۔ اس کے یہاں غزلیہ شعر سازی کے کاروبار کا میکانکی انداز خلاقانہ ہے، مصنوعی نہیں۔ وہ کسی بات کو سائنٹفک انداز

سے اپنے اشعار میں پیش کرنے کا فن جانتا ہے۔ اس کی غزلوں
میں الفاظ کی موسیقیت اور آواز کی انفرادیت اور قوت کو نمایاں
طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ شعر کی لفظی لسانی ہیئت کا خلاقانہ
انداز اور اس کی پُراسراریت ملاحظہ فرمائیں۔

(۱)

نئی اک اور حقیقت بنانے والا ہوں
میں اس کو خواب سمجھ کر بھلانے والا ہوں

(۲)

جو میرا جھوٹ تھا مجھ کو کھرا سمجھتا تھا
میں جس کا سچ ہوں اسے آزمانے والا ہوں

(۳)

انا کی جنگ، خرد کا کھنڈر، جنوں کے چراغ
میں اس محاذ پہ سب کچھ لٹانے والا ہوں

(۴)

کسی کی یاد بھی کتنے ہجوم رکھتی ہے
اکیلا رہ کے میں سارے زمانے والا ہوں

(۵)

کسی کے پاس رہوں تو کسی کی یاد آئے
میں اب کی بار یہ غم بھی اٹھانے والا ہوں

ان اشعار میں خود کلامی کی پراسراریت، داستان ماضی کے
منظر نامے اور حقیقتِ حال کا ایسا المیہ اظہار ہے جس کا ایک
ایک لفظ اور لفظوں کی تہہ داریت سوچنے اور دیر تک محسوس
کرنے پر مجبور کرتی ہے کیا ان اشعار کی روح میں جھانکنے سے یہ
احساس نہیں ہوتا کہ شاعر کے دل میں یادِ ماضی کا ایک طوفان،
کوئی تڑپ، کوئی ایسی خلش اور کوئی جذبہ ضرور موجزن ہے
یہاں اس بات کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ شاعر حسن و جمال
د جو خود بھی ان کا شکار ہے اور اس کا محبوب بھی اسی مکتبِ فکر
کا پروردہ و باشندہ معلوم ہوتا ہے، اس لئے پہلے اور بھی
کتنے افسانوں کو حقیقت بنا چکا ہے۔ گویا شاعر کی زندگی میں
اور کئی ایسے موڑ آ چکے ہیں جن میں اسے ناکامیوں، محرومیوں کا
شکار ہونا پڑا ہے اور انجام کار شاعر اس تلخ حقیقت کو خواب
سمجھ کر بھلا دینے کی (ناکام) کوشش میں مصروف ہو جاتا ہے۔
مگر وہ اس حقیقت کو خواب سمجھ کر اتنی آسانی سے بھلا سکتا ہے؟
یہ اس کا واہمہ ہے اس لئے کہ اسے اس بات کا اعتراف ہے کہ
"جو میرا جھوٹ تھا، مجھ کو کھرا سمجھتا تھا"، یہاں لفظ "جھوٹ"
سے ایک بڑی "سچائی" کا اظہار ہوتا ہے جس میں شاعر کے خاص
جذبات و احساسات مچلتے اور منفرد قسم کے جمالیاتی نقوش و
نغمات میں ڈھلتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ کسی بھنورے کی داستانِ
محبت نہیں، جو پھولوں کے گرد چکر لگا کر اپنی پسند و ناپسند کا
اظہار کرتا پھرتا ہے۔ یہ پیکرِ خاکی کے درد دلوں کی کیفیت انبساط و
اضمحلال کا اظہار ہے جہاں ایک طرف خلوص و محبت کی خود
اعتمادی ہے تو دوسری طرف اس کا منفی اظہار۔ اس شعر میں
"جھوٹ" اور "کھرا" کے الفاظ بالکل پامال قسم کے ہیں، مگر
شاہد جمیل کے خلاقانہ استعمال نے اسے انتہائی بامعنی بنا دیا ہے
جہاں لفظ "جھوٹ" اجنبیت کے منفی تصور کو ظاہر کرتا ہے وہیں
لفظ "کھرا" سے شناسائی کے مثبت پہلو کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

تیسرے شعر میں الفاظ کی سحر انگیز اور طلسماتی
فضا شاعر کی خود دار زندگی کے تمام تر ردِّ عمل اور بوقلمونی کا
اظہار معلوم ہوتی ہے۔ "انا" اور "جنگ"، "خرد" اور "کھنڈر"،
"جنوں" اور "چراغ" یہ تمام استعارے ایک دوسرے میں مدغم
اور پیوست ہو کر بنیادی کیفیت کی تصدیق و توثیق کرتے ہیں جو
اس سے پہلے کے اشعار میں سامنے آ چکے ہیں۔ جنگ اور اس سے
پیدا ہونے والی صورت حال، کھنڈر اور جنوں کا استعارہ اور
اس سے ابھرنے اور پیدا ہونے والی بحرانی کیفیت کے اثر
سے جو منظر ابھرتا ہے اس کی تصویر دوسرے مصرعہ میں دیکھی
جا سکتی ہے۔ یعنی "میں اس محاذ پہ سب کچھ لٹانے والا ہوں"۔

یہاں شاعر کی انا مجروح ہوتی نظر آرہی ہے اور اس سادے اور بیانیہ انداز سے شاعر کی خود سپردگی کا اظہار ہوتا ہے۔

چوتھے شعر کے پہلے مصرعہ میں بظاہر سیدھا سادہ بیان ہے۔ کوئی نکتہ سنجی نظر نہیں آتی۔ مگر جب آپ "کسی کی یاد" پر زور دیتے ہوئے لفظ "ہجوم" تک پہنچیں گے تو بہت سارے خوش گوار مناظر اور زبان و بیان کی مخفی اور پیچیدہ معنویت کھل کر سامنے آجائے گی اور شاعر کا بے باک اور دو ٹوک انداز ظاہر ہو جائے گا۔ شاعر نے یاد کے آئینے میں ہجوم کو منعکس کر کے جو مناظر پیش کئے ہیں ان سے ایسا لگتا ہے کہ شاعر کے گرد پوری دنیا سمٹ کر آگئی ہے اور وہ خود اکیلا ہوتے ہوئے اپنے گرد خوشگوار ہجوم محسوس کر رہا ہے یہاں شاعر نے "یاد" کو علامت کے طور پر استعمال کیا ہے جس سے اس کی سادگی، سچائی اور جذبے کی پاکیزگی کا اظہار ہوتا ہے۔

آخری شعر کو دیکھئے، یہاں شاعر کے لہجے میں غزل کی روایت کے مطابق تنوع پایا جاتا ہے۔ اس کے یہاں یاد، تنہائی اور غم کی پراسرار معنویت، خیالات کی دنیا میں دور تک چلنے اور دیر تک محسوس کرتے رہنے کی طرف راغب کرتی ہے۔ شاعر کو کسی ایک کے پاس رہ کر سکون قلب حاصل نہیں ہوتا، خوب سے خوب تر کی جستجو ہے۔ وہ کسی کے پاس رہتا ہے تو کسی اور کی یاد ستاتی ہے اس کا یہی انداز دلبرانہ اور اظہار کی شوخی سو سو طرح مزہ دے جاتی ہے اور اس کے فوراً بعد ہی اس کے غم اٹھانے والی بات میں شعری توانائی کا ادراک ہوتا ہے۔ اس پوری غزل میں الفاظ کو جن السلاکاتی عمل سے گذارا گیا ہے، وہ شاعر کے چست و درست الفاظ کی بنت کاری کا خوشنما اظہار ہے۔ پہلے شعر میں حقیقت اور خواب، دوسرے شعر میں جھوٹ اور سچ تیسرے شعر میں خرد اور جنون چوتھے شعر میں ہجوم اور اکیلا ـــــــ یہ ایسے الفاظ ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہوئے ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔ اور ایک دوسرے کے مقابلے میں آمادہ پیکار معلوم ہوتے ہیں۔ یہ الفاظ شاعر کی ذہنی کشمکش اور کشاکش کی کارزاریت کو واضح کرتے ہیں۔

یہ پوری غزل ایسا منظر نامہ پیش کرتی ہے جس میں شاعر دو مختلف زاویوں، الجھنوں اور ایسی کشمکش کے درمیان کسی ایسے کی تلاش میں سرگرداں ہے جو اسے سکون بخش فضاؤں میں لے جاتا اور اسے قرب کی سکون بخش اور خوش گوار وادیوں سے ہمکنار کر دیتا مگر یہ ممکن نظر نہیں آتا۔ اس لئے کہ وہ زمانے کے مکر و فریب کے سبب شدید طور پر ناآسودگی کا شکار ہے۔ شاعر ذہنی کشمکش اور کرب و اضطراب سے دوچار ہے۔

شاعر کی دوسری غزل دیکھئے ؎

(۲)

جو بھید اصل تھا وہ تو کبھی کھلا ہی نہیں
میں جس کا عکس ہوں وہ میرا آئینہ ہی نہیں

اداس بیٹھا ہے آئینہ بیچنے والا
کہ اس محل میں کوئی خود کو جانتا ہی نہیں

ہم اپنی دستکیں محفوظ رکھ کے کیا کرتے
کسی مکان میں دروازہ کوئی تھا ہی نہیں

بھٹکتی پھرتی ہیں یادوں کی کشتیاں کیا کیا!
عجیب ہے دل کا سمندر کہ راستہ ہی نہیں

نہ کوئی ڈور، نہ بندھن، نہ راستہ، نہ غبار
یہی کہ اس کے مرے بیچ فاصلہ ہی نہیں

شاہد جمیل کا کمال یہ ہے کہ وہ بات کو سیدھے طور سے کم اور سائنٹفک انداز سے زیادہ کہنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔

اس معنی کر میں اس کی جدیدیت MODERNITY کا قائل ہوں۔ اس کی شاعری کی جو رازدارانہ کرشماتی اور طلسماتی فضائیں ہیں، اس کے معانی و مفاہیم کی تہہ تک پہنچنا آسان نہیں۔ یہاں شاعر نے بھید کا ذکر کیا ہے اور ایسا بھید کہ جس کا انکشاف ہوا ہی نہیں۔ اس لئے بھید کی اصلیت کو جاننے کے لئے قاری کے دل میں جو تجسس پیدا ہوتا ہے وہ بڑا دلفریب اور دیرپا ہے۔ آخر وہ کون سا بھید ہے جو کبھی کھلا ہی نہیں اور یہ کہ کبھی کھل ہی نہیں سکتا۔ اس بیان میں بڑی معنویت اور بڑی گہرائی ہے۔ دنیا کا کوئی انسان اس بات کا دعوی کر ہی نہیں سکتا کہ جو راز سربستہ اس کی ذات سے وابستہ ہیں وہ افشا ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ معاشقے کی بات ہے۔ عشق اور مشک دو ایسی چیزیں ہیں کہ اگر ان کو کسی ڈبے میں بند کر کے سمندر کی تہہ میں ڈال دیا جائے۔ یا ہمالہ کی بلند ترین چوٹی پر رکھ دیا جائے تو یہ اپنی کرشمہ سازیوں، دل نوازیوں اور مختلف ناز و ادا سے اپنے وجود کا اظہار کر ہی بیٹھیں گے۔ یہ ایک کائناتی حقیقت ہے مگر فرد اس حقیقت کو بآسانی تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ وہ طرح طرح سے اس کے اقرار سے امکانی طور پر پہلو تہی کرتا ہے مگر یہاں شاعر کا منفرد نوعیت کا جذبۂ عشق ہے جس کے رازدارانہ پہلوؤں اور معنوی تہہ داریوں کو پہنچنا آسان نہیں۔ اس نے اپنی تخلیقی قوت سے جو پیرایۂ اظہار وضع کیا ہے، وہ غزل کی داخلی و خارجی کیفیت میں بڑی مطابقت رکھتا ہے " عکس" اور " آئینے " میں ایک ایسی زندگی کی پہیلی منعکس ہے جسے بآسانی بوجھا نہیں جا سکتا۔ اس کے عشق میں بڑی سادگی ہے، بھڑکیلا پن نہیں، بلکہ نئے انداز کی سنگینی ہے۔ یہاں اس کی انا انتہائی بیدار ہے۔ اس نے اپنی انا کو فن میں پوری طرح متشکل کر دیا ہے۔

پہلے شعر میں بھید، عکس، آئینہ ——— یہ سب ایسے مقتضیات ہیں جو حیاتیاتی رشتے میں منسلک ہیں۔ انہیں الگ کر کے دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔ بھید کی اصلیت اور حقیقت کے راز کا کبھی نہ کھلنا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ شاعر شعوری طور پر تحتا طار دیئے کا قائل ہے۔ یہاں شاعر کے جذبات کا اظہار کلی طور پر اشاروں اور علامتوں کا تابع معلوم ہوتا ہے اور ان اشاروں اور علامتوں میں ہمہ گیری اور وسعت پیدا ہو گئی ہے۔

دوسرے شعر میں محویت کا عالم ہے۔ محل کا یہ مکین اپنے وجود اور عدم سے قطعی بے گانہ ہو چکا ہے اس کا یہ بے گانہ پن آئینہ بیچنے والے کی اداسی کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے یہ شاعر کا محض سادہ بیان نہیں اس میں کائنات کی وہ ہلچل موجود ہے جس میں انسان اتنا محو ہے کہ خود کو بھول بیٹھا ہے یہ اس کی خود فراموشی یونہی نہیں بلکہ حالات و ماحول کی عکاسی کرتی ہے۔ اس شعر میں آئینے کے استعارے کے لئے بیچنے والے کا استعمال کر کے شاعر نے استعارے کی بنیادی حیثیت کو واضح کیا ہے اور " محل " نے فرد اور کائنات کے باہم رشتے کو منسلک کر دیا ہے۔ شاعر کا یہ انسلاکاتی عمل مرئی و غیر مرئی تقابلات دریافت کرنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ اس میں لاسمتیت کا شکار اور عدم وجودیت کے حصار میں گھرے انسان کی داستان پوشیدہ ہے۔

تیسرے شعر میں تحیر و تاسف کا اظہار ہوتا ہے اور تحیر و تاسف کی بنیادی حیثیت " ہی نہیں " کی ردیف سے واضح ہو جاتی ہے۔ اس طرح شاعر یاس و ناامیدی کے عالم میں اپنی دستکیں محفوظ رکھنے کا فیصلہ قطعی طور پر ترک کر دیتا ہے۔ کسی مکان میں دروازے کا نہ ہونا انسان کی خود غرضی اور بے مروّتی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ اگر کسی مکان میں دروازہ ہو تو یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اگر دستک دی جائے گی تو دروازہ کھولا جائے گا اور اگر دروازہ نہ کھلے تو دوسرا دروازہ کھل سکتا ہے۔ یا کھلنے کی امید کی جا سکتی ہے۔ مگر جہاں بے یقینی کی صورت ہو وہاں

دروازہ ہوتے ہوئے بھی کوئی آواز کوئی دستک صدا بہ صحرا ثابت ہوسکتی ہے۔ یہاں شاعر کا یہ رویہ انسان کی بے حسی اور بے مروتی کو ظاہر کرتا ہے۔ انسان اتنا سفاک و خود غرض ہو چکا ہے کہ رشتے ناطے کی بنیادی حیثیت چور چور ہو چکی ہے۔ آج ہر شخص غیر محفوظیت کا شکار ہوتا نظر آرہا ہے۔ شاعر نے عدم اعتمادی کا یہ اظہار نئے اور نرالے انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ شعر ایسے واقعات کا منظر نامہ ہے جس کا ہم ماتھے کی آنکھوں سے روزانہ مشاہدہ کر رہے ہیں۔ یہاں یہ بات ذہن نشیں رہنی چاہیے کہ کوئی مکان بغیر دروازے کا نہیں ہو سکتا، اگر وہ انسان کا ہے۔ اس لیے یہ بات تعلی عذر طلب ہے کہ پھر شاعر نے یہ غیر فطری نکتہ کیوں بیان کیا؟ جب آپ غور کریں گے تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ شاعر نے موجودہ دور کی سفاکانہ ذہنیت، خود غرضی اور بے مروتی کا پردہ چاک کیا ہے۔ اس دور میں اس روئے زمین پر انسانیت، محبت اور ہمدردی نام کی کوئی چیز باقی نہیں۔ شاعر نے پیش پا افتادہ واقعے کو کس ہنر مندی سے رمزیت اور ایمائیت کے پردے میں پیش کیا ہے۔

شاہد جمیل کی شاعری تقاضے اور رواج کی شاعری نہیں، بلکہ احساسات و جذبات کی شاعری ہے۔ اس کے یہاں احساس، موڈ اور جذبے سے پوری طرح ہم آہنگ ہو کر تقاضائے بشریت کی خوب صورت ترجمانی کرتے ہیں ؎

بھٹکتی پھرتی ہیں یادوں کی کشتیاں کیا کیا!
عجیب ہے دل کا سمندر کہ راستہ ہی نہیں

یہ شعر بھی مذکورہ شعر کی طرح بحرانی کیفیت کو واضح کرتا ہے۔ کشتی کا تعلق سمندر سے اور یادوں کا رشتہ دل سے بڑا گہرا اور اٹوٹ ہے۔ یادوں کو دل سے اور کشتی کو سمندر سے جدا کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ شاہد جمیل کے خلاق ذہن کا یہ کمال ہے کہ وہ جذبے کے مفاہیم کو جو الفاظ عطا کرتا ہے اور الفاظ جس طرح اپنی معنویت کا اظہار کرتے ہیں، وہ شعر کی داخلی اور خارجی کیف و کم سے پوری طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اور ذہن میں رنگوں کی طرح بکھر جاتے ہیں۔ یہاں شاعر کا دل کسی نامعلوم اور انجانی چاہت کے حصار میں گرفتار ہے، وہ اس سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہتا ہے، مگر وہ ایسا کرنے سے قطعی مجبور ہے۔ یادوں کی کشتیاں دل کے سمندر میں راستہ تلاش کر رہی ہیں۔ کوئی منزل، کوئی ساحل دکھائی نہیں دیتا اور وہ یادوں کی کشتیاں دل کے سمندر میں ڈوبتی، ابھرتی، ہچکولے کھاتی شاعر کے غم کو تازہ کرتی ہیں۔ اور پھر یادوں کی کشتیاں انجانی راہوں کا سفر طے کر کے منزل کی تلاش میں جب مایوس کن مرحلے میں داخل ہوتی ہیں تو یہیں سے اس کی نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے اور آخر کار کشتی سمندر میں خود کو ڈبو کر ساحل مراد حاصل کر لیتی ہے جس کا اظہار مذکورہ غزل کے آخری شعر میں شاعر نے بڑے خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے ؎

نہ کوئی ڈور، نہ بندھن، نہ راستہ، نہ غبار
یہی کہ اس کے مرے بیچ کوئی فاصلہ ہی نہیں

اب تعلق براہ راست ہے۔ دونوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں۔ نہ ڈور کا تصور، نہ بندھن کی ضرورت نہ راستے اور غبار کی صعوبتیں۔ یہاں شاعر نے ڈور کے ساتھ بندھن اور راستے کے ساتھ غبار کا خوب صورت استعمال کیا ہے۔

بڑے نقادوں کے نزدیک

"ایمائیت" SUGGESTIVENESS آرٹ کی ایک بڑی خوبی ہے۔ کوئنٹلین QUNTILLIAN جو انگریزی ادب کا ایک بڑا ناقد شمار کیا جاتا ہے، اس کے نزدیک ایمائیت آرٹ کی معراج ہے۔ خود جرمنی کا شاعر گوئٹے جو ناول نگار بھی ہے اور ایک بڑا ناقد بھی۔ ایمائیت کی طرفداری میں لکھتا ہے کہ "آرٹ میں تمام چیزوں کو کھلم کھلا اور تفصیل سے بیان کرنے کی بجائے یہ کہیں زیادہ بہتر ہے کہ ایمائیت سے کام لیا جائے۔" اسی بات کو عبادت بریلوی نے بھی اس طرح بیان کیا ہے" آرٹ کے لحاظ سے وہی تخلیق بلند سمجھی جائے گی جس میں ایمائیت کا پہلو زیادہ

نمایاں ہوگا۔"

اگر آپ کو شاہد جمیل کی شاعری کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہوگا، اور اگر نہیں تو اس مضمون میں منقولہ تینوں غزلوں کو پڑھ جائیے، شروع سے آخر تک رمزیت اور ایمائیت کی گھنی چھاؤں کے ساتھ سنہری دھوپ کا بھی احساس ہوگا۔ اس کے یہاں رمزیت ایسی نہیں کہ جس پر ابہام کا شبہ ہو اور آپ پڑھنے کے بعد دیر تک بھٹکتے رہیں۔ بلکہ بڑی سادگی اور سچائی کے ساتھ کیف و انبساط محسوس ہوگا۔ یہی مقتضیات شاہد جمیل کی شاعری کو آرٹ کا درجہ عطا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے آرٹ کی شگفتگی قاری کے غنچۂ دل کو چٹکاتی بھی ہے اور مسلتی بھی ہے۔ پیچیدہ ماحول اور مشغولیت کے کارزار میں ایسی شاعری کی مثال کم ملتی ہے۔

(۳)

دل کے آسیب کا دنیا سے گلہ ہم نے کیا
شوق سے خود کو گرفتارِ بلا ہم نے کیا

ایک ہی خواب تو موتی کی طرح آنکھ میں تھا
خاکِ دل! تو ہی بتا اس کا بھی کیا ہم نے کیا

جب دعا دی اسے، الفاظ سب اپنے برتے
اس بھلائی میں یہ تھوڑا سا برا ہم نے کیا

یاد سی چیز کوئی لا کے شفق پر رکھ دی
شام کو شام سے اس طرح جدا ہم نے کیا

کاش اک غم بھی ہوا ایسا کہ کبھی جس سے کہیں
دل کی زنجیر سے، جا تجھ کو رہا ہم نے کیا

———

منقولہ تیسری غزل خوب غور سے پڑھیے۔ اس میں ان الفاظ پر توجہ دیجئے ——— "آسیب، گلہ، گرفتار بلا، خواب، موتی، خاکِ دل، دعا دینا، شفق، شام، غم، زنجیر ——— ان تمام الفاظ کی معنویت اور ایمائی پہلو پر غور کیا جائے تو ان میں استعاروں کی کرن پھوٹتی نظر آئے گی اور ان استعاروں میں جو رمز و ایمائیت کی کرنیں پھوٹ بکھرتی ہیں، ان سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ حالات حاضرہ کی صحیح اور سچی ترجمانی کا خوش گوار اظہار اور کیا ہو سکتا ہے۔ دماغ و دل کی درمیانی کشاکش، ہجوم، شور، چیختی تڑپتی سڑکیں، بے نام وحشتیں اور ان وحشتوں، اذیتوں اور دل کو خاک و خون کرنے والے رنج و غم کے درمیان شاعر کی خوش دلی اور زیر لب مسکراہٹ اور تبسم کے زیر اثر پیشانی پر ابھرتی شکنیں زندگی کی ایسی تنقید پیش کرتی ہیں جس میں آج کا انسان سب کچھ برداشت کر رہا ہے اور کرنے پر مجبور ہے۔
غزل کا آخری شعر ہے ؎

کاش اک غم بھی ہوا ایسا کہ کبھی جس سے کہیں
دل کی زنجیر سے جا تجھ کو رہا ہم نے کیا!

اس پورے شعر میں لفظ "کاش" سے جس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے، وہ ہر حساس دل اسے بخوبی محسوس کر سکتا ہے۔ دل کی زنجیر سے غم کی جو وابستگی ہے اسے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ غم انسانی زندگی کا اٹوٹ حصہ ہے۔ مگر یہ شاعر کا کمال ہے کہ وہ غموں کی وادیوں میں سیر تو کرتا ہے مگر سر نہیں پھوڑتا۔ وہ اس کی اذیت اور کرب ناکی کو ہنس کر جھیلتا ہے۔ اس کے یہاں لذتِ بیان کی جو تازگی ہے، وہ زبان کے بے باکانہ استعمال سے نکھری ہوئی اور احساسات سے پوری طرح ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے۔

میں نے اوپر ایمائیت کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ یہ کوئی بڑی چیز نہیں، اگر اعتدال کی حد تک ہو، مگر جدید سے

جدید تر بن جانے کی ناکام ہوس نے ہمارے زیادہ تر شعراء کو ایمائیت کے چکر نے ابہام کی سرحد پر لا کھڑا کر دیا ہے، اور وہ اسے اپنی کامیابی تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ ان کی خام خیالی ہے۔ آج کا انسان اس کے برعکس ناآسودگی کا شکار ہے۔ کل وقت کی فراوانی تھی۔ آج کا انسان مشینی زندگی گذارنے پر مجبور ہے۔ کل کا انسان داستانوں اور طویل ناولوں کا عادی تھا۔ آج شورٹ اسٹوری سننے کے لئے اس کے پاس وقت نہیں۔ پھر ابہام کے چکر میں پڑ کر اور الجھ کر شاعری کی پہیلی کو بوجھنے کے لئے اس کے پاس اتنا وقت کہاں۔ آج جس قسم کی شاعری ہمارے شعرا کر رہے ہیں، اسے نئی زلف فیشن کی شاعری کا نام دیا جا سکتا ہے۔ فیشن اس لئے کہ یہ انگریزیت کے زیر اثر وجود میں آئی ہے اور اس میں اذر آباؤنڈ اور ایلیٹ کی روح داخل ہو گئی ہے۔ کسی بھی چیز کی زیادتی اس کے وزن وقار کو مجروح کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی زیادہ تر فیشن زدہ اور ابہامی شاعری قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں ناکام رہی ہے۔ یہاں شاہد جمیل کے بارے میں بھی یہ بات کہی جاتی ہے کہ اس کے یہاں ابہام در آیا ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ شاہد جمیل کے یہاں جو ابہام ہے، وہ اکتا دینے والا نہیں بلکہ لطف کا باعث ہے۔ اس لئے کہ وہ حد سے تجاوز نہیں کرتا۔ اس کے یہاں قاری کو اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کے یہاں ابہام محض شرارے کی حیثیت رکھتا ہے جو احساسات کی تیز ہواؤں سے بھڑک اٹھتا ہے اور پھر ایک ہی لمحہ میں ایمائیت کا چہرہ نکھر آتا ہے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ابہام کی یہ کیفیت اس کی غزلوں میں برائے نام دیکھنے کو ملتی ہے۔ البتہ اس کی نظموں میں یہ جلوہ گری کچھ زیادہ دیکھی جا سکتی ہے۔

ابتدا سے ہی اس کے فکری و فنی کمالات کو اعتبار کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ کسی وقت بھی اس نے اپنے قد سے کم شاعری کی مثال قائم نہیں کی۔ جب بھی کہا اپنے قد سے بلند کہا۔ شعر کی ان ہی معنوی بلندی نے اس کے معیار و مرتبے کو اتنا بلند کیا ہے۔ شاہد جمیل جدید تر شاعری میں اپنی جگہ بالیقین متعین کر چکا ہے۔ مگر اس کے باوجود "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"۔ اسے ابھی اور اوپر اٹھنا ہے اور یہ "خوابوں کے ہم سائے" اس کی ابھی پہلی منزل ہے۔ ●

شمیم قاسمی
قطب الدین لین، پٹنہ

'خوابوں کے ہم سائے' کا نظم گو

سب سے پہلے میں اس کا اعتراف کرتا چلوں کہ شاہد جمیل میرے ہمعصر شعراء میں اپنی ایک الگ پہچان رکھتا ہے کہ اسے عصری شاعری بطور خاص نظم گوئی کا گہرا شعور ہے۔

شاہد جمیل غزلیں اچھی کہتا ہے کہ نظمیں یا پھر دوہے اس کا فیصلہ کوئی آسان نہیں۔ ہاں، اتنا تو ضرور کہہ سکتا ہوں کہ نظموں کے حوالے سے اس کی شعری شخصیت زیادہ پروقار اور سنجیدہ نظر آتی ہے۔

اپنے ادبی سفر کے ابتدائی دنوں میں اس نے بچوں کی ڈھیر ساری پیاری پیاری اور سبق آموز نظمیں لکھیں جو اس زمانے میں بچوں کے مقبول رسائل کی زینت بنیں جن میں مسرت، غنچہ ثانی، پیام تعلیم، نور وغیرہ میرے حافظے کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ دراصل میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بنیادی طور پر اردو شاعری میں صنف نظم شاہد کے جذبات و محسوسات کا ایک مضبوط وسیلۂ اظہار رہی ہے۔ گویا وہ اس صنف کے زیادہ قریب رہا ہے۔ کیا وہ ایک کامیاب نظم گو بھی ہے۔؟ سر دست میں جواب نہیں دے سکتا کہ اس کا جواب ابھی وقت کے گربھ میں ہے۔ سچائی تو یہ ہے کہ اپنے کسی ہمعصر پر لکھنا بیک وقت دل اور دماغ دونوں کا معاملہ بنتا ہے۔ دل ہے کہ مہتاب کی چمک دمک اور اس کی خوبصورتی پر فدا ہے۔ جبکہ دماغ ذہن، سوچنے سمجھنے اور تجسس کے کرب سے دوچار ہوتا ہے تو اسے بے معنی بنا دیتا ہے پھر دل کو بہلانا آسان نہیں ہوتا دروازۂ دل کے وا ہوتے ہی دماغ متحرک اور حد درجہ محتاط ہو جاتا ہے۔ دراصل انسانی جسم میں اس کی حیثیت رنگ ماسٹر کی ہوتی ہے۔ دل اور دماغ کی اس جنگ میں خوابوں کے ہمسائے کا نظم گو بیچ سادھے کھڑا ہے۔

نظم نگاری بڑی حد تک فکری، موضوعی اور اظہار و بیان کی سطح پر حسن فنی ریاضت اور عبادت کی متقاضی ہوتی ہے۔ اس کا ہمارے عہد کے بیشتر شعراء کے یہاں فقدان ہے شاہد بھی اس سے مستثنیٰ نہیں لیکن اس کے یہاں ایسا کچھ ضرور ہے جو اسے اپنے ہمعصروں کے درمیان انفرادی بناتا ہے اور یہ "کچھ" دراصل اس کی نظموں میں لہجے کا فطری بہاؤ، بیشتر نظموں کا فکشن جیسا ٹریٹمنٹ غیر ہم آہنگ اور غیر شاعرانہ لفظیات کو شعری پیکر میں ڈھالنے کا شعور، ہنر مندی اور ایک طرح کی بے نیازی ہے۔

مندرجہ ذیل نظموں کی یہ چند سطریں ہی اس "کچھ" کے اسباب فراہم کرتی ہیں۔

میرے کمرے میں
کھڑکی کا پردہ ہٹا کر
درندہ کوئی، گھس رہا ہے
گوا ڑوں میں، اکی ہول، سے آنکھ عفریت کی جھانک کر
دیکھتی ہے۔

قریہ" وینٹی لیٹر" کے چمگادڑیں جھولتی ہیں
کتابوں کے ٹیبل سے چمٹا ہوا سانپ پھن کاڑھتا ہے۔
وہاں ہینگر سے لٹکتا ہے بچھو
وہ ٹی وی کے پیچھے سے ہوتی ہے جو سرسراہٹ کسی کا کرچ
کی نہیں ہے۔
لحاف اور بستر میں تکیہ کے نیچے سرکتے ہوئے کنکھجوروں
کا دل ناچتا ہے
مری آنکھوں میں رینگتی ساعتوں سے لرزتی ہے دیوار
(کمرے سے باہر کا خوف)

میں جانتا ہوں کہ تم کو حیرت ضرور ہوگی۔
تمہیں بتاؤں کہ تم کو چھونے کا ہر تجسس بھی ایک سچ ہے
پھر اس پہ پلنے کی ہر تمنا میں دوسرا سچ
اور اس طرح کے ہزاروں سچ ہیں
کہ سچ کا خوابوں سے کیا تعلق
(خواب زاروں کے سائے سائے)

کہ میں خدا کو صدائیں دیتا جنوں سے سرگوشیوں میں مشغول
خود کلامی کے بیکراں عالم فسوں میں نڈھال
بے سمت، بے جہت بے اماں آوارگی میں مقسوم
لمحہ لمحہ بکھر رہا ہوں
میں چاہتا ہوں
کہ تم مری نامراد آنکھوں سے میرا کوئی بھی
خواب مت لو
(ایک تنہا اداس موسم)

ان نظموں کا خالق اگر ناسٹلجیا کا شکار ہو جاتا ہے اور خود کلامی کے بیکراں فسوں میں نڈھال دکھائی دیتا ہے تو تعجب کا مقام نہیں کہ وہ عہد بیمار کا مسیحا نہیں بلکہ اس کا جیتا جاگتا کردار ہے۔ اسے خواب بڑے عزیز ہیں اور متاع جاں بھی۔ وہ خواب کی تعبیر نہیں ڈھونڈتا۔ وہ تو خواب در خواب دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھیں ہر لمحہ ہر پل خواب دیکھتی ہیں خواب بنتی ہیں اور خواب جنتی بھی ہیں۔ آنکھوں کی راہ سے دل کی وادی میں اترنے کا ہر عمل خواب ناک ہے۔ خواب دراصل شاعر کی شعری کائنات میں اس کی اپنی شخصی زندگی کی بے اطمینانی، ناآسودگی اور ایک طرح کی تخلیقی آوارگی کا طاقت ور استعارہ ہے۔

تم اک حقیقت جہاں بھی محدود ہو مجھے کیا
کہ میری آنکھوں نے خواب کر کے
تمہیں کچھ ایسے سجا لیا ہے
مرا سفر میرا بوجھ اٹھائے
تمہیں نہ چھو کر، تمہیں نہ پا کر بھی
ہر تعلق، ہر ایک منظر
ہر ایک موسم میں
صرف تم کو ہی چھو رہا ہے
تمہیں کو ہر سمت پا رہا ہے
(خواب زاروں کے سائے سائے)

"خوابوں کے ہمسائے" کے خالق کی آنکھوں میں ایک نہ ختم ہونے والے طلسمی خواب زاروں کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ خوف، اندیشہ اور ایک طرح کی حزنیت زدہ خوابناکی کے اس صبر آزما اور ان دیکھے سفر میں ساحل کی تمنا اسے ہر لمحہ ہر لحظہ ایک ایسے بھنور کی طرف کھینچے لئے جاتی ہے جہاں خود کلامی اور خود احتسابی کے سوا اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا

خدایا!
مجھے کیا ہوا ہے؟
ہوا کیا ہے آخر مجھے
یہ کن وحشتوں میں شب و روز جینا مرا ہو رہا ہے
مرے قہقہوں میں یہ کیسی اداسی مجھے ڈس رہی ہے
مری محفلوں میں یہ کس سونے پن کی صدا چیختی ہے
مرے دوستوں میں، یہ کس دشمنی کی ہواؤں کے جھکڑ

مجھے کھینچ کر منظرِ عام پر لا رہے ہیں
(خود احتسابی کی ایک شام)

جاگتی اور سوئی ہوئی آنکھوں کے خوابوں کی ہم سائیگی اضطرابی کیفیت کے اس نظم گو کے لئے نہ صرف سکون آور ہے بلکہ اس کے شعری سفر کی توانائی اور طمانیت بھی۔ ہر لمحہ ایک بے نام سی اداسی، محرومی اور ایک جان لیوا ادھورے پن کے شدید احساس نے خوابوں کے ہمسائے کے نظم گو کو INSOMNIA کا مریض بنا دیا ہے۔ وہ کسی سے کوئی گلہ کوئی شکوہ نہیں کرتا۔ حدِ نظر بکھرے ہوئے تمام مظاہر و مناظر اس کی ذات میں گم ہو گئے ہیں اور وہ اظہارِ لفظ و معنی کی تلاش میں ایک نئی دنیا کا تمنائی نظر آتا ہے۔

انتظار اس آنکھ کا، جو تیری ہے
انتظار اس خواب کا — جو آگہی ہے
انتظار — اس لفظ کا — جو شاعری ہے
انتظار و انتظار و انتظار!
(طویل جمود کے دوران ایک نظم)

مذکورہ نظموں میں خوابوں کے ہمسائے کے نظم گو کے لہجے کی ساخت اگر بہت اچھوتی بھی نہیں ہے تو بھی ایک خاص ذائقہ اور فنی رچاؤ لئے ہوئے ہے، اس کی لفظیات کی فکری معنویت میں ایک پراسراریت اور تکنک کے تجربے شامل ہیں۔ بڑے کینوس کی بعض چھوٹی چھوٹی نظمیں جیسے خواب ٹھکرانے کا فیصلہ، درد، ایک گونگا سوال، ایسی بھی کیا آنکھ مچولی اور زندگی: ایک بے کار بحث وغیرہ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ شاعر نہ صرف نئی نظم کے فن سے آشنا ہے بلکہ زبان و بیان اور ذات و کائنات کا اسے مٹھی بھر عرفان حاصل ہے۔ محض چار سطروں پر مشتمل زیرِ نظر نظم میں جو فکری اور موضوعی تجربہ ہے وہ بڑا آفاقی اور فنی پختگی لئے ہوا ہے۔

درد کے انجام سے
آغاز بہتر تھا
کم از کم تجربہ تو (کچھ عجب ہونے کا)
بالکل نیا تھا
(نظم: درد)

"خوابوں کے ہمسائے" کے نظم گو کی تقریباً تمام نظموں میں ایک بے نام سی اداسی کی دھند چھائی ہوئی ہے جو جاں سوز بھی ہے اور جاں گداز بھی اور شاعر کی شعری کائنات کا جواز بھی۔ اس دھند میں شاعر کی شعری اور ذاتی شخصیت ایک دوسرے میں مدغم ہو گئی ہے اسے "ڈھونڈ نکالنا" کوئی آسان نہیں کہ اس کی بیشتر نظموں میں جو معنوی تہہ داری اور آشفتہ سری ہے وہ قاری کو غیر دانستہ طور پر اپنے حصار میں باندھ لیتی ہے اور وہ ایک ناقابلِ بیان کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے کہ ان نظموں میں "ڈرامائی عناصر" بھی شامل ہوتے ہیں جو محض چونکاتے ہی نہیں ہیں سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں اور میرے خیال سے "خوابوں کے ہمسائے" کے نظم گو کا یہ وصف خاص ہے۔ اپنے ان تاثرات کو میں شاہد جمیل کی ایک نظم کی مندرجہ ذیل سطروں پر سمیٹنا چاہتا ہوں کہ ہر لمحہ بکھر جانے کا احساس شدت پکڑ رہا ہے۔

قلم جو چاہتا ہے لکھ رہا ہے
میں جو کچھ سوچتا ہوں وہ نہ لکھوں
بہت مجبور ہوں
میرے قلم کو میری سوچوں سے زیادہ اپنی آزادی
سے الفت ہے۔
لہٰذا
یوں نتیجہ کچھ کا کچھ ہی جا نکلتا ہے۔
(میں اور میرا قلم)

●

رفیع حیدر انجم

آزاد نگر، ارریہ (بہار)

خاکہ

ہم سائے کے خوابوں کا شاعر

میں شاہد جمیل کا ہمسایہ کبھی نہیں رہا۔ ایسا ہونے میں شاہد جمیل کی احتیاط کو دخل ہو تو ہو، میری کسی سازش کا نتیجہ ہرگز نہیں۔ ہاں اتنا یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں شاہد جمیل کا ہمسایہ ہوتا تو میرے خوابوں کا شاعر یہی شخص (شاہد جمیل) ہوتا۔ یوں بھی شاہد جمیل کا ہمسایہ میرے شہر میں کوئی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ یہاں انہوں نے بیشتر وقت ہوٹل کے کمرہ میں گذارا ہے جہاں کوئی مستقل ہمسایہ ہو ہی نہیں سکتا۔ البتہ آخر کے چند ماہ انہوں نے کرائے کے مکان میں بھی آزمائے لیکن تب تک ان کی بیگم کو ان کے خوابوں کی ہمسائیگی کی کاپی رائٹ حاصل ہو چکی تھی۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیر واضح اور مبہم اشیا خوابوں میں صاف صاف نظر آنے لگتے ہیں۔ شاہد جمیل کا سراپا ناقابلِ فہم تو نہیں ہے لیکن اگر آپ انہیں برہنہ آنکھوں سے دیکھیں گے تو صرف ایک شخص شاہد جمیل نظر آئے گا ــــــــــ دبلا پتلا سا......... ......عمومی شکل و صورت اور قد و قامت کا ایک شخص جیسے فلموں کا اداکار انو کپور......... (اطلاعاً عرض ہے کہ شاہد جمیل کو انو کپور ناپسند ہے۔ فن کاروں کو اپنے ہمزاد سے اکثر نفاق رہا ہے) مگر آنکھوں میں ذہانت کی غیر معمولی چمک اور ہونٹوں پہ اپنائیت بھری مسکراہٹ سے سجے سجائے اس آدمی میں شاعرانہ کشش ہے جو دوسروں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لیتی ہے۔ قدرت نے انہیں ہزار دیئے سے شاعرانہ صفت سے نوازا ہے لیکن ہمارے یہاں شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ المیہ یہ ہے کہ انہیں فن کار ہونے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہونا پڑتا ہے۔ لہٰذا شاہد جمیل محکمہ رجسٹریشن کے افسر بھی ہیں۔ ذوق و غالب کے زمانے میں شاعر بادشاہِ وقت کے دربار کی سجاوٹ ہوا کرتے تھے لیکن آج وزیر و افسر بن کر خود جشنا دربار سجاتے ہیں۔ (دورِ حاضر میں شاعر کا مرتبہ بلند ہوا ہے اور شاعری کا معیار پستی کی طرف مائل ہے۔) دراصل ہر دور کا اپنا ایک گراف ہوتا ہے۔ شاہد جمیل کی شخصیت کے گراف میں دو متوازی لکیریں کھنچی ہوئی ہیں۔ ایک ان کے اندر کا شاعر اور بقیہ ان کے باہر کا افسر۔ اور دونوں کی لکیریں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ شاہد جمیل کا مقابلہ ان ضدی لکیروں سے اکثر ہوتا رہتا ہے۔

وہ خوش نصیب تھے اک دوسرے کے دشمن تھے
مرا مقابلہ ہر موڑ پر مجھی سے تھا

شاہد جمیل اس دشمنی کو بھلے ہی خوش نصیبی تصور کرتے ہوں لیکن ان دونوں کے مقابلے میں انہوں نے خود کو غیر جانبدارانہ رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں اچھی، بُری، دیرپا اور پُر تاثیر شاعری کیلئے غیر جانبدارانہ روش ناگزیر ہے۔ بصورتِ دیگر تجربات و مشاہدات کی شعری ترسیل و تشکیل میں توازن بحال رکھنا محال ہو جائے گا۔ شاہد جمیل کی شاعری ماچس کی بند ڈبیہ میں پڑی ہوئی تیلی کی طرح ہے۔ اس سے لطف و انبساط کی چنگاری

حاصل کرنے کے لئے ذات و کائنات سے گہری وابستگی لازمی ہے۔ لہٰذا شاعری کے عام قاری کے لئے میرا مشورہ ہے کہ شاہد جمیل کے شعری کائنات سے ہم آہنگ ہونے کے لئے پہلے آنکھیں بند کر کے اپنا محاسبہ کیجئے۔ بہت ممکن ہے اس عمل میں آپ نیند کے حلقۂ اثر میں داخل ہو جائیں اور نیم خوابیدہ کیفیت سے گذرنے لگیں لیکن تبھی ان کی شاعری کے اسرار و رموز سے پردہ سا اٹھتا ہوا محسوس کریں گے۔

شاہد جمیل کا پہلا شعری مجموعہ "خوابوں کے ہم سائے" ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔ ادبی دنیا میں بیس پچیس سال کے عرصے کو لوگ خاطر میں نہیں لاتے۔ اس لحاظ سے ان کا مجموعۂ کلام تازہ تازہ واقعہ ہے لیکن مجھے یقین ہے اس کتاب میں شامل نظموں اور غزلوں کو ادب کے سنجیدہ قارئین برسوں یاد رکھیں گے۔

کچھ شعر دھیمی دھیمی آنچ کی طرح ذہن کو سلگاتے رہتے ہیں :-

دل وہ پتھر ہے جو ہر موج سہا کرتا ہے
غم وہ ندی ہے جو ہر وقت بھری رہتی ہے

یہ سارے شہر میں کیسا غبار پھیلا ہے
میں ٹوٹ ٹوٹ کے بکھرا تو خامشی سے تھا

بھٹکتی پھرتی ہیں یادوں کی کشتیاں کیا کیا
عجیب ہے دل کا سمندر کہ راستہ ہی نہیں

پھر سے عمارتوں کی طرف جھانک لو ذرا
ممکن ہے اب وہیں کوئی ملبہ دکھائی دے

مجھے اتنے خطوط اس نے لکھے تھے
مجھے لگتا تھا، وہ مجھ سا کبھی ہوگا

ایسے بہت سے شہ پارہ اشعار "خوابوں کے ہم سائے" میں بکھرے پڑے ہیں۔ (آپ چاہیں تو اس آنچ سے اپنے لئے ایک کپ چائے تیار کر سکتے ہیں۔ چائے کے فلیور کے ساتھ شعروں کا لطف دوبالا ہو جائے گا)

شاہد جمیل کی ادبی زندگی میں ایک اور ناقابلِ فراموش واقعہ پیش آنا ابھی باقی ہے اور وہ ہے بچوں کے لئے لکھی گئی نظموں کی اشاعت (مجھے اندیشہ ہے، ان نظموں کو بچے اپنے بڑھاپے تک یاد رکھیں گے۔)

شاہد جمیل سے پہلی ملاقات میرے ایک دوست کی خواہش پر ہوئی تھی جو ملنے ملانے کے معاملے میں کافی انرجیٹک ہیں۔ حالانکہ مجھے پہلے سے خبر تھی، شاہد جمیل بسلسلۂ ملازمت اندنوں میرے شہر میں مقیم ہیں۔ لیکن مجھے شاعروں سے روبرو ہونا صرف مشاعروں میں اچھا لگتا ہے کہ یہیں ان کے جوہر (تیور بھی) کھلتے ہیں۔ لہٰذا میں کسی ایسے ہی مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ یوں بھی مجھے افسانہ نگاروں سے ملنے کا اشتیاق زیادہ رہا ہے۔ (ظاہر ہے کبوتر کبوتر سے دل لگاتا ہے اور باز باز سے) لیکن جب ہماری ملاقات ہوئی اور گفتگو کا سلسلہ دراز ہوا تو لگا بہت سارا وقت اچھا گذر رہا ہے۔ اس کے بعد آئندہ بہت سی ملاقاتوں کے درمیان یہ انکشاف بھی ہوا کہ جدیدیت کے عنفوانِ شباب میں انہوں نے افسانہ بھی لکھا تھا۔ اور ایک افسانہ (عنوان حد درجہ تجریدی ہونے کی وجہ سے یاد نہیں رہا۔) "شب خون" میں شائع بھی ہوا۔ (آج کے "شب خون" میں اس زمانے کے تیور نظر نہیں آتے۔) ویسے شاہد جمیل چاہیں تو کچھ بھی لکھ سکتے ہیں۔ فلم کے گانوں اور اسکرپٹ سے لے کر مثنوی بحرِ عشق (زہرِ عشق کی اب گنجائش نہیں رہی) تک جو کچھ بھی لکھیں گے وہ غیر معیاری ہرگز نہیں ہوگا۔ ان کے نزدیک تخلیق کا معیاری ہونا پہلی شرط ہے اور اس شرطِ اولین کو انہوں نے بہ حیثیتِ مدیر اپنے ادبی رسالہ "جدید اسلوب" میں سختی سے برتنے کی کوشش بھی کی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ رسالہ "جدید اسلوب" کی ادبی حلقے میں کافی پذیرائی ہو رہی ہے۔

معاشرے کا ہر فرد ادب کا عینک لگا کر ادیب و شاعر کو نہیں دیکھا پرکھتا۔ (ایسا ہونا ممکن بھی نہیں ہے) آدمی کا آدمی سے تعلق گوناگوں توقعات کا متقاضی ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ دوسروں کی امیدیں، خواہشات اور ضروریات تنہا ایک آدمی پوری نہیں کر سکتا۔ لیکن کسی نہ کسی صورت اسے ایک حد تک کم ضرور کر سکتا ہے۔ شاہد جمیل نام نہاد رسومات اور ظاہر داری

کے قائل نہیں ہیں۔ لیکن ان کے اندر انسانی رواداری کا جو جذبہ کار فرما ہے وہ دوسروں کی احتیاج کو رفع کرنے کی کوشش میں موجزن رہتا ہے۔

ایک بار جب میں نے ان سے ادبی میگزین نکالنے کی اپنی خواہش کا اظہار کیا تو وہ دامے، درمے، قدمے، سخنے ہر طرح سے تیار ہوگئے اور میرے اس ارادے کو لے کر مجھ سے زیادہ سنجیدہ ہوگئے (میں اب تک رسالہ نہیں نکال سکا۔ ہوسکتا ہے اب وہ اس طرف سے رنجیدہ ہوگئے ہوں) وہ ہمیشہ میرے تعطل کو توڑنے کی تحریک دلاتے اور مجھے لکھنے کے لئے اکساتے رہتے۔ مجھے یہ اقرار کرنے میں ذرا بھی عار نہیں کہ مجھے ان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا ہے۔ شاعری کے علاوہ دیگر اصناف ادب کی انہیں اچھی پرکھ ہے۔ خصوصاً زبان و بیان پر انہیں دسترس حاصل ہے۔

ہر آدمی کی اپنی پسند و ناپسند ہوتی ہے۔ اور ردّ و قبول کا یہ جذبہ آدمی کی سرشت میں شامل ہے۔ شاہد جمیل کو نقلی شاعر، جعلی ناقد اور گندی سیاست سے نفرت ہے (اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہایت شریف آدمی ہیں) انہیں ابن صفی، پھول، خوشبو اور عمدہ لباس سے عشق ہے۔ لیکن یہ چیزیں آپ انہیں بطور رشوت دینے کی غلطی ہرگز نہ کریں کیونکہ شاہد جمیل ایک محتاط شخصیت کا نام ہے۔ اگر آپ دانستہ یا نادانستہ، بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کی ذہنی سطح سے نیچے آنے کا خطرہ مول لیں گے تو بہت ممکن ہے ان کی نگاہوں سے بھی اتر جائیں۔

شاہد جمیل کے اندر ذوق جمال کی اتنی کثرت ہے کہ ناتواں آدمی کو اس بھیڑ میں اپنی شناخت بچالے جانا دشوار ہو جاتا ہے۔ حسنِ جمالیات کی اس انتہا سے کھردرے لوگوں کو اکثر کوفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ (انتہا پسندی ہے ہی بری چیز خواہ یہ انسان کی نیکی و شرافت ہی کیوں نہ ہو)

فن کار ایک شخص ہوتا ہے اور فن اس شخص کے ذاتی تجربات و مشاہدات کا فن کارانہ پرتو۔ لیکن فن کار کی شخصیت ایک ایسے پراسرار تہہ خانے کی طرح ہے جس کے اندر داخل ہونے کے لئے ایک طلسماتی کلید کی ضرورت پڑتی ہے جن لوگوں کو شاہد جمیل پسند نہیں آئے، میرا خیال ہے انہیں اس طلسماتی کلید کا سراغ حاصل نہیں ہوسکا۔ یوں بھی اس سائنسی دور میں طلسمات کے چکر میں پڑ کر کوئی اپنی جان جوکھوں میں کیوں ڈالے۔ طلسم کا شوق تو فنکاروں کا مشغلہ ہے ●

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں
شعبۂ اُردو، بہار یونی ورسٹی، مظفر پور

ندرتِ احساس کا شاعر: شاہد جمیل

شاہد جمیل نئے اور جوان شاعروں میں قادر الکلام شاعر شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کا لب ولہجہ، انداز فکر اور طرز اظہار سب نیا ہے۔ وہ ایک حساس اور صاحب دل شاعر ہیں۔ ان کے پاس حسین یادوں اور رنگین خوابوں کا توشہ ہے ساتھ ہی زندگی کے تلخ تجرباتِ اور دلدوز واقعات وسانحات کا بارگراں بھی ان کے دوش پہ ہے اس لئے شاہد جمیل کے یہاں موضوع اور مواد کی کمی نہیں۔ وہ آپ بیتی کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ہر شخص اس میں اپنی بیتی کی نقوش پالیتا ہے۔ شاہد جمیل کے ذاتی رنج و الم اور مسرت شادمانی ہی ان کے قلم کو متحرک کرتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ گرد وپیش کے حالات سے باخبر نہیں۔ یہاں صرف مثال کے طور پر ان کے شعری مجموعہ "خوابوں کے ہمسائے" کی ایک نظم "نیا سال" کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

ہر روز نکلتا ہے سورج
پر رات تو بڑھتی جاتی ہے
ہر صبح چٹکتے ہیں غنچے
اور آنکھ برستی جاتی ہے
ویسے ہی فسادی ہاتھوں سے
گھر اب بھی جلائے جاتے ہیں
ہاں اب بھی خون کی ہولی سے
تیوہار منائے جاتے ہیں
ہر کام پرانے سال کا ہم
ہر نئے برس میں کرتے ہیں
مرنے کو زندہ رہتے ہیں
اور زندہ رہ کر مرتے ہیں
یہ کھیل کہ جب تک جاری ہے
ہر رقص کہن لہرائے گا
ہم جس دن خود کو بدلیں گے
اس روز نیا سال آئے گا

شاہد جمیل کی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار ان کی نظموں میں ہی ہوا ہے ان کی نظموں میں جہاں ذاتی رنج ونشاط کا ذکر ہے وہیں فرد کی بے بسی، اس کے خوف وہراس اس کی بیچارگی اور اس کے عدم تحفظ کے احساس کو خصوصی طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔ سماج کے بعض ہولناک مناظر، خونی واقعات اور فسادات کا بھی ذکر ملتا ہے۔ لیکن یہ سب علامتوں استعاروں اور کنایوں کی صورت میں ہیں۔ کسی بھی تجربے کا سپاٹ اظہار شاعر کو پسند نہیں۔ یہ چیز ان کی شاعری کی فنی قدر وقیمت اور جذباتی اپیل کو بڑھا دیتی ہے۔ نظم "گھر سے باہر کا خوف" اس کی عمدہ مثال ہے۔ اس نظم میں جہاں فرد کی تنہائی اور خوف کا

ذکر ہے وہیں سماج کے ہولناک مناظر کی جانب بلیغ اشارے بھی ہیں۔ فرد کا خوف کوئی بے وجہ خوف نہیں، اس خوف کے بہت سے اسباب ہیں اور ان اسباب کی جانب بلیغ اشارے نظم کے متن میں چھپے ہوئے ہیں۔ ایک دوسری نظم "پھر وہی برسات" میں بھی فرد کی جذباتی کیفیتوں کا نہایت شاعرانہ اور مؤثر بیان ہے۔ برسات کے موسم میں خصوصاً برسات کی بھیانک کالی رات میں فرد جس طرح جذباتی مد و جزر اور نفسیاتی بحران سے دو چار ہوتا ہے اس کی بڑی سچی اور خوبصورت عکاسی ملتی ہے

شاہد جمیل کے یہاں جن تجربوں یا جن احساسات کا ذکر ہوا ہے ان میں بڑا رکھ رکھاؤ اور تہذیبی شائستگی پائی جاتی ہے جو انہیں جدید شاعروں میں ممتاز مقام عطا کرتی ہے ان کے یہاں سطحی عشقیہ جذبات اور شائستگی کی سطح سے گرے ہوئے جنسی تجربات کا بیان بالکل نہیں ملتا۔ یہ چیز ان کے کلام کو پاکیزہ اور قابل مطالعہ بناتی ہے۔ ورنہ ہمارے قدیم اور جدید شعراء میں بہت سے اس معاملہ میں معیار سے گر گئے ہیں جمیل اپنی خالص عشقیہ نظموں مثلاً "تم خواب سہی" "تمہاری یاد" وغیرہ میں بھی اپنے جذبات کی پاکیزگی اور طہارت قائم رکھتے ہیں۔ یہ بڑی خوبی ہے۔

شاہد جمیل کے یہاں بیشتر خوابوں کی شکست اور فرد کے جذباتی بحران کا ذکر ملتا ہے اس کے باوجود ان کی بعض نظمیں حوصلوں اور ولولوں سے معمور ہیں۔ "خوابوں کے ہمسائے اور" آوارگی کی حمایت میں ایک خشک نظم" اس سلسلے میں پیش کی جا سکتی ہے شاعر نامساعد حالات کے باوجود عزم سفر رکھتا ہے وہ پر خار وادیوں میں پابہ جولاں ہونے کی ہمت رکھتا ہے فاصلے اور راستوں کی رکاوٹیں اس کے قدموں کو نہیں روک سکیں۔ اس کا شوق سفر جوان ہے اور وہ علامہ اقبالؒ کے لفظوں میں "ع ۔ حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں" کا قائل ہے آوارگی حمایت میں ایک خشک نظم" کا آہنگ اور تیور ایسا ہے کہ پڑھنے والا بھی جوش و ولولہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ صرف یہ ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

پھر بھی، شوقِ سفر کی جبلت
اپنے قدموں میں قائم رہے گی
فاصلوں کو یہ مژدہ سنا دو
حیثیت ان کی یوں بھی مسلّم رہے گی
دھوپ کی پتلیاں
بے شجر راستے
اور لہو سے بھرا سرخ موسم
فاصلوں کو مسلح کریں تو کریں
میرے شوقِ سفر پہ اثر انکا کچھ بھی نہ ہوگا
فاصلے میری نظروں میں بس فاصلے ہی رہیں گے
کوئی منزل نما کھوکھلا پن
میرے قدموں سے الجھے نہ الجھے
حوصلے میرے ہنس ہنس کے شاہدؔ
ہر صعوبت سے ملتے رہیں گے
ریت میں پھول کھلتے رہیں گے

شاہد جمیل کی تخلیقی صلاحیت اپنے اظہار کے لئے کسی بندھے ٹکے سانچے کی پابند نہیں۔ وہ نظم معرّیٰ، نظم آزاد کے ساتھ ساتھ پابند نظم کی ہیئت کو بھی اپنے اظہار کا ذریعہ بنا لیتے ہیں معرّیٰ اور آزاد نظموں میں بھی قافیوں کی جھنکار چست بندشوں اور خوبصورت ترکیبوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ شاعر کو زبان و بیان پر جو قدرت ہے اسے نظم کا قاری بآسانی محسوس کر سکتا ہے شاعر اظہار کے گوناگوں پیرائے اور اپنے تجربوں کی ترسیل کے لئے نہایت مناسب اور رچنے ہوئے الفاظ کی ایسی ترتیب کرتا ہے کہ تجربہ کا چہرہ جگمگا اٹھتا ہے۔

شاہد جمیل کی شاعری میں ایک عجیب تازگی اور زندگی کی حرارت محسوس ہوتی ہے۔ شاعر کا ردّ عمل زندہ اور تابناک ہے

وہ نہایت حساس اور جذباتی ہے۔ لیکن جذبات کی رو میں نہ وہ سطحیت کا شکار ہوتا ہے۔ اور نہ لفاظی اور بے جا طول کلامی کا۔ اختصار و جامعیت، کنایوں اور اشاروں کی زبان اسے پسند ہے اور یہ چیز اس کے کلام کی بلاغت کو بڑھا دیتی ہے۔

شاہد جمیلؔ کے شعری مجموعہ "خوابوں کے ہمسائے" میں کچھ نظمیں اور غزلیں ایسی ہیں جو انہوں نے اپنے حقیقی جوان بھائی کے اچانک انتقال پر لکھی ہیں۔ ان نظموں اور غزلوں میں شاعر کی شخصیت اور فن کا ایک اور رخ سامنے آتا ہے۔ شاعر اپنے غم کو نغمہ کی زبان عطا کرتا ہے۔ ایک ایسی زبان جس میں استعاروں کی عجیب جدت اور قافیہ و ردیف کی عجیب ندرت نظر آتی ہے۔

شاہد جمیل کی غزلیں بھی ان کے عمومی طرز احساس اور اسلوب اظہار کی آئینہ دار ہیں۔ غزلوں میں نیا لب و لہجہ اور انوکھا انداز نظر ملتا ہے۔ بعض اشعار تو ایسے ہیں کہ زبان پر فوراً رواں ہو جاتے ہیں اور حافظے سے چپک کر رہ جاتے ہیں چند اشعار بطور مثال ملاحظہ ہوں ؂

تمام عمر یوں کیا کہ خواب میں مگن رہے
سمندروں کا عزم تھا سراب میں مگن رہے

حقیقتوں کے شہر کی حکایتیں کچھ اور تھیں
کمال تھا کہ ہم فقط کتاب میں مگن رہے

بھٹکتی پھرتی ہیں یادوں کی کشتیاں کیا کیا
عجیب ہے دل کا سمندر کہ راستہ ہی نہیں

ملنے والے کو جھٹک دیتا تو ممکن ہے جمیلؔ
جو نہ ہاتھ آئے اسے کون بھلا سکتا ہے

گھٹن کے وقت بھی دائرے کے اندر تھے
ہوا چلی تو کوئی شخص ہم مزاج نہ تھا

خلاصۂ کلام یہ کہ شاہد جمیلؔ کا مجموعہ "خوابوں کے ہمسائے" ایک معطر و مزین ادبی تحفہ ہے۔ جس کے مطالعہ سے مسرت اور بصیرت کے بے شمار دریچے وا ہو جاتے ہیں۔ شاہد جمیل کا شعری مجموعہ اس یقین کو جنم دیتا ہے کہ وہ اور آگے کی منزل طے کریں گے اور دنیائے شاعری میں ان کا مقام اور بلند ہوگا۔●

ڈاکٹر اسلام عشرت
شعبۂ اُردو، بی ایس کالج، دانا پور (پٹنہ)

شاہد جمیل کی شاعری اور عصری عناصر

اُردو کے مشہور و ممتاز شاعر بلراج کومل نے مجید امجد کے متعلق ایک جگہ یوں لکھا تھا۔ "مجید امجد آغاز سفر میں ہر روایتی مسافر کی طرح ساز و سامان سے لیس نظر آتے ہیں، لیکن جوں جوں وہ اپنی منزل کے قریب پہنچتے گئے، وہ ساز و سامان کے تکلف سے دور ہوتے چلے گئے۔"

مندرجہ بالا عبارت شاہد جمیل کی شاعری پر حرف بہ حرف صادق آتی ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شاہد جمیل نے بھی مجید امجد کی طرح اپنی شاعری کا آغاز بالکل روایتی انداز میں کیا۔ اس دور میں انھوں نے جو غزلیں کہیں یہاں ان کا تذکرہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس عہد کی غزلوں کے چند منتخب اشعار درج ذیل ہیں:

شیخ جی اب تو ضرور آئیں گے میخانے میں
ہم نے ساقی کا نیا نام خدا رکھا ہے

کھو جائیں چاندنی میں جی چاہتا ہے لیکن
دل ڈوب جائے ایسا منظر کوئی نہیں ہے

کس طرح بھلا ہم پہ نصیحت کا اثر ہو
ناصح کی ہر اک بات تو افسانہ لگے ہے

بعد ازاں انھوں نے مذکورہ بالا ٹائپ کی شاعری سے کلی وجزوی طور پر کنارہ کشی اختیار کر لی اور اس علیحدگی کے بعد انھوں نے جو پہلی غزل کہی، وہ واضح طور پر تبدیلیٔ مزاج اور تبدیلیٔ ذہن کی بہترین ترجمانی کرتی ہے۔ ان کی یہ غزل قدیم و جدید غزل کے مابین ایک اہم و خوبصورت کڑی یقیناً تسلیم کی جائے گی۔ لہٰذا مثال کے طور پر چند اشعار منقول ہیں:

نگل نہ جائیں کہیں تیرگی کے اندھے ناگ
تمام رات چھپا ڈر سے آفتاب رہا

ہر اک کے خواب کو پورا کیا خدا بن کر
یہ اور بات ہے میں خود ادھورا خواب رہا

چبا گیا وہی تریاق جان کر مجھ کو!
میں جس کے زہر سے اک عمر فیضیاب رہا

شاہد جمیل جس معاشرے میں پیدا ہوئے، پلے، بڑھے اور جوان ہوئے۔ وہ کثافتوں اور ناہمواریوں کا معاشرہ تھا۔ اس میں داخلی و خارجی جبر و استبداد بھی تھا اور استحصال بھی۔ یہی وجہ ہے کہ شاہد جمیل کی شاعری کی نمایاں سطح ایک ایسے حساس انسان

کے ردعمل کا نتیجہ ہے، جو زندگی کے مظاہر کی ارضی تفصیلات شب و روز دیکھتا ہے لیکن وہ ان زخموں اور خراشوں کو دیکھ کر اداس ہو جاتا ہے، جس سے اس کے معاشرے کے بیشتر افراد دوچار ہیں۔ شاہد جمیل بھی اپنے گرد و نواح کے ماحول کی جزئیات سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ اسی لئے وہ اس کے در و دیوار، چھتوں، بازاروں اور گلیوں کوچوں کو ایک قریبی دوست کی طرح جانتے ہیں۔ اور اسے اپنی شخصیت کا ایک لازمی عنصر سمجھتے ہیں۔ شاہد جمیل کی شاعری حقیقت، ادراک، کرب، احساس، جذبہ اور بغاوت سے عبارت ہے۔ بعض دفعہ ان کا اظہار کھلے الفاظ میں ہوا ہے اور بعض اوقات اشاروں و کنایوں کی زبان میں۔ مثلاً

ہوا اب تک وہی ہے جو تسلم کرتا رہا ہے
کھڑا للکارتا ہے
مجھے شہرت دلانے کے سب احسانات گنواتے ہوئے
دس میں صلواتیں سناتا اور مجھے غیرت دلاتا ہے
بہت ہنستا ہے مجھ پہ
کہ میں اس غار میں گھٹ گھٹ کے خود ہی جاں بحق ہو جاؤں گا اک روز
اُسے گر چھوڑ دوں گا

قلم کی دھمکیاں اور میں
مری مجبوریاں اور وہ
چناں چہ یوں ہی ہو جاتا ہے ہر بار
کہ خود داری کی اپنی کینچلی سے باہر آکر
میں اس کے حکم پہ
پھر دوسرے پل دست بستہ حاضر خدمت ہوا ہوں

(میں اور میرا قلم)

پانیوں کے سینے میں سورج کا خواب!
پتھروں کے بس میں شیشے کا شباب!!
زندگی بے کار کی اک بحث ہے
اضطراب و اضطراب و اضطراب!!!

(زندگی: ایک بے کار بحث)

سفر یہ جاری رہے گا
کہ آنے والا کل
ہمارے ذوق کو پرکھے اور احتساب کرے
کہ یہ اُمنگ، یہ ہمت، یہ حوصلہ، یہ لگن
ہماری سر د سرشتوں میں نسل نسل سے ہے
کہ سچ کو بھول کے ہم
خود کو پھر دکھائیں گے خواب
پھر ایک دست شفا، ہو بہو اسی کی طرح
کہیں سے ڈھونڈھ کے لائیں گے
اور سہیں گے عذاب
کہ یہ عذاب ہمیں ہر مرض سے پیارا ہے
سفر یہ ختم نہ ہوگا
سفر یہ جاری ہے!
ہمارے عہد کی یہ رات کتنی بھاری ہے!!

(بیمار عہد کا المیہ)

اُردو زبان و ادب کے ممتاز و منفرد نقاد ڈاکٹر عنوان چشتی نے اپنے ایک مضمون میں آج کی اُردو شاعری کی زبان اور اسلوب کی نمایاں خصوصیات کو جو بڑی حد تک ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں۔ چار رجحانوں کا نام دیا ہے، پہلا استعارہ سازی کا رجحان اور دوسرا امیجری کا رجحان، تیسرا علامت کی نگاری کا رجحان اور چوتھا ہیئت کے تجربوں کا رجحان ـــــ شاہد جمیل کی شاعری میں بھی چاروں رجحانات پائے جاتے ہیں۔ استعارے میں ایک خیال اور ایک تصویر ہوتی ہے، دونوں ایک دوسرے سے تحلیل ہو کر شاعری کا جادو جگاتے ہیں۔ تشبیہ، استعارہ کی واضح اور استعارہ، تشبیہ کی مجمل صورت کا نام ہے۔ ملاحظہ ہو استعارہ سازی کا رجحان ـــ
محبت جیسا پاکیزہ تھا

وہ جذبہ عجب تھا !

عبادت جیسا سنجیدہ تھا

وہ چہرہ غضب تھا !!

وہ اک جذبہ ، وہ اک چہرہ

مرے چاروں طرف پہرہ

خدایا - !!

تو حقیقت ہے ترا شہکار پھر کیوں خواب .... !!!

(" یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے ! ")

اور اب پیکر تراشی بھی دیکھیے - پیکر میں تصویریت نمایاں اور تصویر در تصویر ہوتی ہے گویا پیکریت ایک قسم کی SYNTHESIS ہے۔ اس میں خیال اور جذبے کو اس کی تمام تر پیچیدگی کے ساتھ اظہار کرنے کی صلاحیت موجود رہتی ہے ——

سمندر کی زرخیز آوارگی

کھیتوں سے پٹ کر —— کہ اب ان کے پاؤں تلے بہہ رہی ہے

سبھی جانتے ہیں !

بہاؤ کا یہ راستہ

شہر ہی کی طرف گامزن ہے

جہاں ڈھیر ساری بچاری ہوا کو ترستی ہوئی نالیاں ہیں

سمندر کا جو حشر ہوگا

خدا جانتا ہے !!

(: آوارہ سمندر)

نئی شاعری کی جمالیات میں SYMBOL کے لیے علامت کا لفظ اختیار کیا گیا ہے - علامت کوئی متعین صورت نہیں رکھتی - ہر لفظ، ترکیب، استعارہ، تشبیہہ، دیومالائی اشارہ یا پیکریت علامت کا درجہ اختیار کر سکتا ہے - اردو کی نئی شاعری میں علامت نگاری پر مغرب کا پورا اثر ہے - علامت نگاری کی مثال ملاحظہ فرمائیے :

دھند جیسی سخت کوئی شے

غموں کی رات تھی

دھند جیسی نرم کوئی شئے

ہماری ذات تھی

دھند کی تجسیم کے اس پار کوئی شئے

ہماری آنکھ سے نکلی ہوئی برسات تھی

وقت ! تیری پیاس

کتنی تیز ہے —— !!

(دھند کی تجسیم کے اس پار)

اردو شاعری میں دو طرح کی ہیئتیں پائی جاتی ہیں - روایتی اور غیر روایتی —— ان دونوں ہیئتوں کو بھی ہم دو حصوں میں منقسم کر سکتے ہیں، پہلی وہ ہیں جو دیسی زبانوں کے وسیلے سے اردو میں آئیں - مثلاً گیت، سرسی، ہندی چھند سار، بنگالی گیت، ہر گیتکا اور لوک گیت اور دوہے وغیرہ —— دوسری وہ جو مغرب کے زیر اثر منتقل ہو کر اردو میں آئیں - مثلاً نظم معرا، سانیٹ، آزاد نظم، ترائیلے اور مختصر نظم کے سانچے اور نثری نظم وغیرہ —— ذیل میں ہیئتی تجربوں کے رجحان کی مثال پیش ہے :-

نظم " اے میری تنہائی ! " کا پہلا بند یوں ہے :

اے میری تنہائی ! آ قریب آ !

میں ایک ٹوٹتا ہوا ستارہ نہ جانے کس کی سحر میں گم ہوں

میں ایک بجھتا ہوا نظارہ نہ جانے کس کی نظر میں گم ہوں

میں ایک اُجڑا ہوا جزیرہ نہ جانے کس کی خبر میں گم ہوں

میں ایک دریا کا ایک قطرہ نہ جانے کس چشم تر میں گم ہوں

میں ایک ہارا ہوا پرندہ نہ جانے کن بال و پر میں گم ہوں

میں ایک زندہ کر دشتوں کے نہ جانے کیسے کھنڈر میں گم ہوں

اے میری تنہائی ! آ قریب آ !

اس کے بعد آخری بند ملاحظہ ہو :

میں —— اک ستارہ

میں —— اک نظارہ

میں —— اک جزیرہ

میں ـــ ایک قطرہ
میں ـــ اک پرندہ
میں ـــ ایک زندہ
کہ زندگی جس کی وحشتوں کے کھنڈر میں گم ہے
اے میری تنہائی ! آ قریب آ ،
میری صدا تیرے گھر میں گم ہے :

عصر حاضر کے شعرا کی ایک عام خصوصیت رہی ہے کہ وہ سخت سے سخت تر زمین میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ چناں چہ شاہد جمیل بھی اکثر اوقات یہی رویہ اختیار کرتے ہیں۔ انہیں نئے نئے قوافی و ردیف تلاش کرنے اور نئی نئی زمینوں میں غزلیں کہنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ مثلاً:

بہر لحاظ ضروری ہے آئینہ ، لیکن !
اغل بغل سے گزرتے ہیں لوگ بھی کچھ تو

دھوپ کی تتلی کے پیچھے دوڑتا ہے
چھوٹے بچوں کی طرح چھت پہ دسمبر

بارشیں زنداں ، قیدی ہے جولائی
اے مرے دل ! تیرے جیسی ہے جولائی

حسرت کی اوس تک نہیں اے آرزو کی آگ !
جلتی ہے اور کس لیے میرے لہو کی آگ

مری سزا کی عمارت مری خطا سے بلند
خلا میں سر کو پٹکتے لہولہان سجود

نظامِ روشنی گھروں میں تھا عجب
دریچے سرمئی تھے اور در سفید

نئی شاعری کی علامات میں ریت، دشت، سمندر، پانی، خواب، جنگل، چہرہ، رات، دھوپ، دوپہر، صحرا، شجر، اندھیرا، بگولے، سانپ اور سڑک وغیرہ جیسے الفاظ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ یوں تو یہ الفاظ دنیائے اردو شاعری میں ہمیشہ ہی سے مستعمل رہے ہیں۔ لیکن جدید تر غزل میں اس قسم کے الفاظ جس کثرت سے اور جس طرح نئے نئے مفاہیم کے ساتھ استعمال کیے جارہے ہیں، وہ اپنی مثال آپ ہیں، شاہد جمیل نے بھی ان الفاظ کو اپنی غزلوں میں انتہائی فن کاری اور خوش سلیقگی سے برتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہو :

سوچتا ہوں کہ اُسے کون سا منظر کہتا
ریت کا جسم تھا، کیا ہاتھ لگا کر کہتا

بچھڑتے دشت کی مٹی تھی ، پاؤں کستی تھی
اکھڑتے خیموں کی بنیاد بے حیات نہ تھی

عشق، آدم، حسن، حوّا، سانپ، جنت اور گناہ
جاننا ہر شے کو تھا، پہچاننا کچھ بھی نہ تھا

بکھرتے برگ پہ یہ کس کا نام لکھا ہے
لپٹ لپٹ کے شجر سے ہوائیں روتی ہیں

دھوپ اُکتائی ہوئی پھرتی ہے سڑکوں سڑکوں
میرا گھر ہے کہ برسوں سے سویرا مانگے

تمام عمر یوں کیا کہ خواب میں مگن رہے
سمندروں کا عزم تھا، سراب میں مگن رہے

چہرہ، کنول، نہ دل کوئی دریا دکھائی دے
اب کے برس تو شہر میں صحرا دکھائی دے

شاہد جمیل کی شاعری کے متعلق مختلف مقامات پر مختلف حضرات نے اپنی اپنی گراں قدر رائے دی ہے۔ یوں تو وہ شاعری پچیس ۲۵ تیس ۳۰ برسوں سے کر رہے ہیں لیکن ان کا پہلا شعری مجموعہ "خوابوں کے ہم سائے" بے حد تاخیر سے ۱۹۹۲ء میں منظر عام پر آیا ہے (حالاں کہ میں گزشتہ دس سال سے شعری مجموعہ ترتیب دینے کا ان سے مطالبہ کرتا رہا ہوں۔ بہرکیف۔)

ع کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

شاہد جمیل کے متعلق پروفیسر علیم اللہ حالی نے ان کے زیر تذکرہ مجموعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے تین اہم خصوصیات بیان کی ہیں۔ وہ درست ہیں، مثلاً:

۱۔ شاہد جمیل کی شاعری اپنے بعض حقائق کی وجہ سے امتیاز کی حامل ہے۔

۲۔ شاہد جمیل کی لفظیات اور ان کا لہجہ نجی جذبوں کو بھی POPULAR شاعری بنانے کا اہل ہے۔

۳۔ یہ بات مسلم ہے کہ پہلے مجموعے سے ہی شاہد جمیل ہمیں چونکاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میری سنو جو گوش حقیقت نیوش ہے۔ نئی آوازوں کے اس ہجوم میں ان کی آواز صاف سنی جاتی ہے، یہ معمولی بات نہیں۔

—— ماہنامہ "سہیل" (گیا)۔ شمارہ ۳، جلد ۵۲

شاہد جمیل کے بارے میں ایک بزرگ افسانہ نگار بدر اورنگ آبادی ایک مقام پر یوں رقم طراز ہیں:

> "گذشتہ چند برسوں میں جن شعرا نے شعری دنیا کو چونکایا ہے، ان میں شاہد جمیل کا نام نمایاں ہے۔ نظم و غزل دونوں اصناف میں معنویت کی گہرائی، انداز بیان کا انوکھا رنگ، الفاظ کے صوتیاتی حسن اور موضوع کا پورا منظر نامہ یکساں طور پر نظر آتا ہے، اس لیے یہ فیصلہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ شاہد جمیل "بنیادی طور پر" غزل کا شاعر ہے یا نظم کا۔"

—— دوماہی "زبان و ادب" (پٹنہ)۔ شمارہ ۳، جلد ۳۰

شاہد جمیل کی شاعری کے متعلق ان کے شعری مجموعے کے فلیپ پر بلراج کومل، کمار پاشی اور محمود ہاشمی جیسی نامور ادبی شخصیتوں کی رائے سے ہی اس کی قدر و قیمت و اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہاں ان کی آرا نقل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے، البتہ ایک بات کی وضاحت لازمی ہے کہ ان تینوں حضرات نے اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ شاہد جمیل کی شاعری میں اظہار و بیان پر دسترس، لب و لہجے کی تازگی اور ندرت پائی جاتی ہے اور وہ جدید تر نسل کے تازہ کار رویے اور طرز فکر کے نمائندہ شاعر ہیں۔ علاوہ ازیں شاہد جمیل کی شاعری کے متعلق دوسرے اہل قلم بھی اپنی رائے دیتے ہوئے اسی قسم کا اظہار خیال کرتے ہیں۔ مثلاً عاصم شہنواز شبلی اپنے تبصرہ میں کہتے ہیں:

> "وہ جدید نسل (۱۹۷۰ کے آس پاس ابھرنے والے شعرا) میں نہ صرف ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں بلکہ اپنے لہجے اور اپنی آواز کی وجہ سے پہچانے بھی جاتے ہیں۔ حیرت ناک تازگی، تیکھا احساس، جدید تخیلی مزاج، شاعرانہ حسن اور صاف سلیس زبان شاہد جمیل کی شاعری کی پہچان ہیں۔"

—— ماہنامہ "انشاء" (کلکتہ)۔ شمارہ ۵، جلد ۹

سیفی سرونجی ایک مقام پر تحریر کرتے ہیں:

> "وہ سب سے الگ، سب سے جدا لہجے کے شاعر ہیں۔ جن کی شاعری میں تہہ داری، فکر و گہرائی نمایاں ہے اور یہی بڑی اور اچھی شاعری کی مثال ہے۔ ان کے یہاں تخلیق کا تجربہ اتنا گہرا ہے کہ بعض نظمیں پڑھنے سے تو یوں لگتا ہے کہ ہم کسی شاعر کو نہیں بلکہ ایک مفکر کو پڑھ رہے ہیں۔"

مذکورہ بالا آرا کی روشنی میں درج ذیل اشعار دیکھیے تو آپ یقیناً قائل ہو جائیں گے۔

سخن کا در د ہے کس انکشاف سے سرشار
مرا قلم ترے غم کے طواف سے سرشار

انا کی جنگ، خرد کا کھنڈر، جنوں کے چراغ
میں اس محاذ پہ سب کچھ لٹانے والا ہوں

اس کی رائے مرے بارے میں غلط ہے لوگو
شیشہ پتھر کا خطا وار نہیں ہو سکتا

آنے والی نسل کو مقروض یوں کرتے رہے
جلنے والے کو بہت ساری دعائیں دی گئیں

بدن ہے کانچ کا لیکن محققو، ٹھہرو!
سنبھل کے ہاتھ لگانا کہ سنگسار ہوں میں

شاخِ دل توڑ دی اور پھول وہیں رہنے دیا
بے وفائی میں سلیقے سے یہ احسان ہوا!

شاہد جمیل کی شاعری کا اگر بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ بھی اردو کے دوسرے جدید تر شعرا کی طرح نئی فکر، نئی حسیت، اور عصری آگہی سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری عصر حاضر کے تمام تر تقاضوں سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ چند مثالیں پیش ہیں:

دھواں، غبار، لہو، پیاس کچھ تو لیتے جاؤ!
ہمارے شہر سے لوٹو گے اور خالی ہاتھ؟

صحن ہے یا فقط دریچہ ہے
اب مکمل مکاں نہیں ملتا

شفاف گہر کے جو صدف تھے
ملبوسِ غبار و گِل رہے تھے

اُداس بیٹھا ہے آئینہ بیچنے والا
کہ اس محل میں کوئی خود کو جانتا ہی نہیں

دل وہ پتھر ہے جو ہر موج سہا کرتا ہے
غم وہ ندی ہے جو ہر وقت بھری رہتی ہے

میرے خیال میں شاہد جمیل کی شاعری اپنی سنجیدگی و متانت، اپنے انفرادی اسلوب، اور دعوتِ فکر کے اعتبار سے اپنے معاصرین شعرا میں دور ہی سے پہچانی جا سکتی ہے۔ ●

شیریں اختر
مریم منزل، اینو کریم گنج، گیا

شاہد جمیل کی نظم نگاری

(’خوابوں کے ہم سائے‘ کی روشنی میں)

’خوابوں کے ہم سائے‘ شاہد جمیل کا ایک قابل قدر شعری مجموعہ ہے۔ ’خوابوں کے ہم سائے‘ میں شامل نظمیں شاہد جمیل کے نئے تجربات، احساسات اور محسوسات سے بھرپور ہیں۔ ان کی نظموں میں فرد اور کائنات کے مسائل، محرومیوں اور وحشتوں کے سائے، خوابوں اور یادوں کے دھندلکے اور زندگی کے آثار چڑھاؤ ہر جگہ نمایاں ہیں۔ جس کا اعتراف خود شاہد جمیل مجموعہ کے پیش لفظ ’چند سطور‘ میں یوں کرتے ہیں۔

”شاعری میرے لئے بے نام وحشتوں سے فرار کا معاملہ ہے، جنوں چکا چوند سے نمٹنے، احساسات کی آندھیوں میں بکھرے ہوئے معنی و اسلوب کے خوش رنگ چراغوں کو بچا کر نکال لے جانے کا معاملہ ہے خون جلانے، خون سجانے اور خون کو خواب و گلاب کر دینے کا معاملہ ہے۔“

”خوابوں کے ہم سائے“ کی متعدد نظموں میں شاہد جمیل نے نئی نئی علامتوں و استعاروں کا استعمال کیا ہے، یہ علامتیں اکثر پیکروں کی شکل اختیار کر کے ہمیں دور فضاؤں میں لے جاتی ہیں اور کبھی ڈرامائی کیفیت میں مقید ہو کر قاری کو بار بار جھنجھوڑنے کا سامان بہم کرتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہد جمیل پیچیدہ تجربات و احساسات کو بیانیہ پیرایۂ اظہار میں پیش کرنے کے روادار نہیں بلکہ علامتی اسلوب اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کے انفرادی رنگ، فنی رکھ رکھاؤ، تشبیہات و استعارات کے انوکھے استعمال کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ اس طرح ان کی نظموں میں نئے پیکروں کا وجود نمایاں ہوتا ہے۔ مثلاً۔

میں ایک ٹوٹا ہوا ستارہ نجانے کس کی سحر میں گم ہوں
میں ایک بجھتا ہوا نظارہ نجانے کس کی نظر میں گم ہوں
میں ایک اجڑا ہوا جزیرہ نجانے کس کی خبر میں گم ہوں
میں ایک دریا کا ایک قطرہ نجانے کس چشم تر میں گم ہوں
میں ایک ہارا ہوا پرندہ نجانے کن بال و پر میں گم ہوں
میں ایک زندہ کہ وحشتوں کے نجانے کیسے کھنڈر میں گم ہوں

(اے میری تنہائی)

اس کانچ کے حوالے
جو میری روح میں ہے
یادوں کی برچھیاں ہیں
خوابوں کی کشتیاں ہیں
اشکوں کی وادیاں ہیں
میں پھر بھی جی رہا ہوں!

(ماضی کہیں نہیں ہے)

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ شاہد جمیل نے اپنے کئی مخصوص موضوعات کا انتخاب کر کے انہیں نئی تکنیک سے جدید آہنگ دینے کی کوشش کی ہے جن میں بیمار عہد کا المیہ، کمرے سے باہر کا خوف، خوابوں کے ہم سائے، پھر وہی برسات، وجود کا آسیب، ایک بوجھل شام کا گیت وغیرہ نظمیں

خصوصی طور پر متوجہ کرتی ہیں۔

"خوابوں کے ہم سائے" میں شامل دو نظمیں "نیا سال" اور "نیا موسم" عصری صورتِ حال کی دہشت انگیزی اور فرقہ وارانہ فسادات کا منظر نامہ پیش کرتی ہیں۔ نظموں کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

ہر صبح چٹکتے ہیں غنچے
اور آنکھ برستی جاتی ہے
ویسے ہی فسادی ہاتھوں سے
گھر اب بھی جلائے جاتے ہیں
ہاں اب بھی خون کی ہولی سے
تیوہار منائے جاتے ہیں

(نیا سال)

یہ موسم بے بسی کا ہے
یہ موسم بے حسی کا ہے
یہ موسم بے رُخی کا ہے
اور اس موسم کا صرف اس شہر پر ہی کچھ اثر ہو
ایسا اب بالکل نہیں ہے
یہ موسم اب کے سب ہی شہروں اور ملکوں میں
کافی دور تک پھیلا ہوا ہے،
کسی کی کوئی بات
کسی کے کانوں تک جانے سے پہلے
خلا میں ہی اٹک کر رہ گئی ہے
کسی کی چیخ نکلی تو
وہ بس کھڑکی کے شیشوں میں ہی پھنس کر رس رہی ہے۔

(نیا موسم)

شاہد جمیل کی نظم نگاری میں خود کلامی کا عنصر بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ اکثر جگہوں پر وہ خود سے ہم کلام نظر آتے ہیں۔ ان میں خیالات، احساسات اور جذبات کو محسوس کرنے کا جو انوکھا انداز ملتا ہے یہ ان کے کلام کی ایک اور خصوصیت ہے بقول محمود ہاشمی:

"خود کلامی کے سحر میں رچی ہوئی، شاہد جمیل کی آواز ہمارے بیمار عہد کے المیہ کا اظہار ہے۔"

اس کے علاوہ کئی نظمیں ایسی بھی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہد جمیل بعض مقبول و معروف شعراء سے بھی متاثر ہوئے ہیں۔ ان نظموں میں کہیں فیض احمد فیض، کہیں اختر الایمان اور کہیں مخمور سعیدی کا آہنگ نمایاں ہے۔ مثلاً فیض کے رنگ و آہنگ کے اشعار ملاحظہ ہوں:

میں ایک موسم
اُداس تنہا شجر کی مانند
جانتا ہوں
کہ میری تنہائیوں کی وحشت
کسی بھی محفل کے قہقہوں میں اُگے ہوئے جنگلوں کے دکھ سے
کہیں زیادہ عظیم تر ہے
مری اُداسی کی ہر حقیقت
کسی مسرت سے
معتبر ہے۔

(ایک تنہا اُداس موسم)

کوئی منزل نما کھوکھلا پن
میرے قدموں سے اُلجھے نہ اُلجھے
حوصلے میرے ہنس ہنس کے شاید
ہر صعوبت سے ملتے رہیں گے
ریت میں پھول کھلتے رہیں گے۔

(آوارگی کی حمایت میں ایک خنک نظم)

نظم "آوارہ سمندر" پر مخمور سعیدی کے اسلوب کا اثر خاصہ نمایاں ہے۔ چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

اور پھر ایک دن اس طرح بھی ہوا
سمندر ــــ اِدھر سے اُدھر، اِس جگہ، اُس جگہ

سب مقدس زمینوں کا خوں چاٹتے چاٹتے
دربدر یوں بھٹکتا ہوا
اپنے مرکز سے ہٹتا ہوا ___ دور اور دور ہوتا گیا
ریزہ ریزہ حسابوں میں بٹتا ہوا
کھیتوں، کھلیانوں، باغوں میں محصور ہوتا گیا
اب یہ عالم ہے
ساری مقدس زمینوں کی نازک ادا کھیتیاں
انتقام آزما ہو چکی ہیں
حسیں، شوخ چنچل ہوائیں
کہ طوفان کی ہم نوا ہو چکی ہیں
سمندر کی زرخیز آوارگی
کھیتوں سے لپٹ کر۔ کہ اب اُن کے پاؤں تلے بہہ رہی ہے۔

اسی طرح بعض میں خالص احساسات اور تاثرات کے ساتھ اختر الایمان کی طرح استفہامیہ انداز بھی پایا جاتا ہے، مثلاً:

خدایا۔!
مجھے کیا ہوا ہے۔؟
ہوا کیا ہے آخر مجھے۔؟
یہ کن وحشتوں میں شب و روز جینا مرا ہو رہا ہے؟
مرے قہقہوں میں یہ کیسی اداسی مجھے ڈس رہی ہے؟
مری محفلوں میں یہ کس سونے پن کی صدا چیختی ہے؟
(خود احتسابی کی ایک شام)

زندگی! اے زندگی یہ تو بتا
میں پریشاں ہوں کہ تیرا کیا کروں
تیرے ہونٹوں پہ کھلے ہیں پھول   کیا اُن کو چنوں؟
تیرے ہاتھوں پہ لکھے ہیں گیت   کیا اُن کو پڑھوں؟
تیری آنکھوں کے دیے جلتے ہیں   دلِ روشن کروں؟
(زندگی: سامنے سے ایک سوال)

ایک طویل پابند نظم "سرگزشتِ لمحۂ موجود" موضوع اور مواد کے اعتبار سے ایک نمائندہ نظم ہے جس میں مصائب کا مقابلہ کر کے خوش آئند مستقبل کی بشارت دی گئی ہے۔

تری آنکھوں میں میری آرزو اکتا رہی کیوں ہے
تمنا دھڑکنوں کی ڈور کو اُلجھا رہی کیوں ہے
ابھی سے خوابوں کی تابندگی کجلا رہی کیوں ہے
ابھی سورج چمکتا ہے، ابھی سورج چمکتا ہے
(سرگزشتِ لمحۂ موجود)

"تم خواب سہی" اس مجموعے کی ایک خوبصورت نظم ہے، جو فطرت کی لطیف کیفیت کی ترجمان ہے:۔

تم خواب سہی لیکن
خط میرا حقیقت ہے
تھک ہار کے لوٹا ہے
اور اس کا مجھے غم ہے
دیدار کا موسم ہے
کھوئے ہو کہاں جاناں!
(تم خواب سہی)

"خوابوں کے ہم سائے" کی مختصر نظموں میں 'میری حقیقت'، 'درد'، 'دکھ مرے'، 'اے مرے دشمن' وغیرہ قابل ذکر نظمیں ہیں۔ ایک مختصر نظم میں شاہد جمیل نے زندگی پر فلسفیانہ نظر بھی ڈالی ہے۔ ان کے نزدیک زندگی ایک بے کار بحث بھی اور مسلسل اضطراب بھی۔ اسی طرح شاہد جمیل کی زندگی کے بعض نجی حادثے اور ذاتی غم ان کی شاعری کی رگ و پے میں سرایت کر گئے ہیں اور کبھی کبھی یادوں کا المیہ بن کر نظم کی شکل میں درد و تاثیر پیدا کرتے ہیں۔

کیا عجب ہے!
جب تلک تھا ساتھ میرے تو
مجھے وقتاً فوقتاً یاد آتا تھا
خدا جانے خدا کے ساتھ جب سے تو ہوا ہے،
کوئی لمحہ مرا تیرے تصور سے نہیں خالی!
(کیا عجب ہے)

یہ تیری قبر ہے!

یا میرا صبر ہے

قبر سے صبر تک کا سفر! کچھ نہیں کچھ نہیں اک مسلسل اذیت کا زندہ
اندھیرا کھنڈر

میں تیری قبر پہ فاتحہ کے بہانے سے مکڑی کے جالے بُنوں (اور تُو؟)
تو مرے صبر میں مسکراہٹ کے جگنو اُڑاتا پھرے -!

(قبر سے صبر تک کا سفر)

"خوابوں کے ہم سائے" کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہد جمیل عصر حاضر کے مسائل سے پوری طرح آشنا ہیں۔

عہد جدید کے مشینی دور میں انسان کی تنہائی، گھٹن، ٹوٹتے بکھرتے رشتوں کا کرب اور گوناگوں دکھوں کی سلگتی ہوئی صلیب —— ان سارے موضوعات پر ان کے یہاں خوب صورت نظمیں ایک خاص رچاؤ کے ساتھ مل جاتی ہیں۔ بقول کمار پاشی:

"اظہار و بیان پر جن چند جدید تر شعراء کو دسترس حاصل ہے، ان میں شاہد جمیل کا نام سب سے نمایاں ہے۔"

اس لحاظ سے شاہد جمیل کی نظم نگاری اُردو شاعری میں ایک تازہ باب کا اضافہ ہے۔ ●

انوار الحسن وسطوی
باغ ملی، حاجی پور (بہار)

شاہد جمیل کا انفرادی لہجہ

ہندو پاک کی نئی نسل کے جن شاعروں نے جدید اردو شاعری کو نیا لہجہ اور آہنگ بخشا ہے ان میں شاہد جمیل کا نام نمایاں ہے۔ "خوابوں کے ہم سائے" میں مشاہدات کی روشنی بھی ہے اور تجربات کی آنچ بھی، آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔ کتاب کے آغاز میں "چند سطور" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شاہد جمیل نے اپنا تخلیقی سفر زمانۂ طالب علمی (۱۹۶۹ء) ہی سے شروع کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ تخلیقی زندگی کے چھبیس سال کے دوران کسی حساس شاعر کو مشاہدات اور تجربات کا اس قدر ذخیرہ تو ہاتھ آہی جائے گا کہ وہ ماہ و سال کی دھوپ چھاؤں میں آپ بیتی اور جگ بیتی کی عکاسی کر سکے۔ چنانچہ "خوابوں کے ہم سائے" کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاہد جمیل نے زندگی کے ان پہلوؤں کو غور سے دیکھا اور پرکھا ہے جو تلخ تجربات اور دل دوز واقعات و سانحات کی شکل میں ان کے سامنے آئے ہیں۔

شاہد جمیل کے مجموعۂ کلام کا نام "خوابوں کے ہم سائے" انتہائی معنی خیز ہے۔ خوابوں کی شکست آج کے انسان کا مقدر ہے۔ ہر فرد اپنے خوابوں کے بکھر جانے، ٹوٹ جانے کا شکوہ گزار ہے لیکن نئے خواب دیکھنے اور نئے نئے منصوبے اور نقشے بنانے، نئی دنیا اور مثالی معاشرے کی تعمیر و تشکیل کے خواب دیکھنے کا سلسلہ جاری ہے۔ خواب دیکھنا ہر انسان کی سرشت بھی ہے اور اس کا مقدر بھی۔ فرد کے خوابوں کو باہر کی بے رحم دنیا اور حالات کو منتشر کر دینے کے درپے ہے۔ لیکن فرد احساسِ محرومی اور حزن و ملال کے باوجود شکست قبول کرنے اور سپر انداز ہونے کے لئے تیار نہیں۔ فرد کا سفر جاری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ بہت ٹوٹا ہوا۔ بکھرا ہوا۔ تہی دست ہے۔ لیکن اس کی آرزوئیں باقی ہیں، اس کا عزم ختم نہیں ہوتا ہے اور نئی منزلوں کی تلاش کے لئے آج بھی وہ سر بکف آگے بڑھ رہا ہے۔ اس روشنی میں شاہد جمیل کی ایک نظم "خوابوں کے ہم سائے" کا ایک بند ملاحظہ ہو ؂

ہم جیسے آوارہ لوگ
خوابوں کے ہم سائے ہیں
خوابوں کی سچائی کو
باندھ لیا ہے آنکھوں سے
آنکھیں جب تک تکتی ہیں
راہیں جب تک چلتی ہیں
خواب سفر میں روشن ہے
روشن ہے ہر نقش قدم
کہیں نہیں کوئی منزل
خواب خود اپنی منزل ہے

مذکورہ نظم سے جس حوصلے اور ولولے کی عکاسی ہوتی ہے اس کی معراج اگر دیکھنا ہو تو شاعر کی ایک دوسری نظم

"آوارگی کی حمایت ایک خشک نظم" کا یہ بند بطور خاص پیش کیا جاسکتا ہے جس کا آہنگ اور تیور جوش و ولولے سے معمور ہے ؎

پھر بھی
شوق سفر کی جبلّت
اپنے قدموں میں قائم رہے گی
فاصلوں کو یہ مژدہ سنا دو :
حیثیت ان کی یوں بھی مسلّم رہے گی
دھوپ کی پتلیاں
بے شجر راستے
اور لہو سے بھرا سُرخ موسم
فاصلوں کو مسخّر کریں تو کریں
میرے شوقِ سفر پہ اثر ان کا کچھ بھی نہ ہوگا
فاصلے میری نظروں میں بس فاصلے ہی رہیں گے
کوئی منزل نما کھو کھلا پن
میرے قدموں سے الجھے نہ الجھے
حوصلے میرے ہنس ہنس کے شاہدؔ
ہر صعوبت سے ملتے رہیں گے
ریت میں پھول کھلتے رہیں گے ۔

شاہد جمیل کی تمام نظمیں پابند ہوں یا آزاد قابلِ مطالعہ اور توجہ کی مستحق ہیں ۔ مجموعۂ کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں ۔ اسی لئے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار ان کی نظموں ہی میں ہوا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ شاعر نظم ہی میں اپنے گوناگوں مشاہدات ، تجربات اور احساسات کی پوری ترجمانی کرسکتا ہے ۔ موصوف اس ضمن میں بڑے اعتماد کے ساتھ سامنے آئے ہیں ۔ نظموں سے چند حصّے ملاحظہ ہوں ؎

آتا ہے نیا ہر سال مگر
ہر کام پُرانا کرتا ہے

ویسے ہی فسادی ہاتھوں سے
گھر اب بھی جلائے جاتے ہیں

ہاں اب بھی خون کی ہولی سے
تیوہار منائے جاتے ہیں

ہر کام پُرانے سال کا ہم
ہر نئے برس میں کرتے ہیں

مرنے کو زندہ رہتے ہیں
اور زندہ رہ کر مرتے ہیں

(نیا سال)

عجب ہے صورتِ حال
کہ موسم دور، کافی دور تک پھیلا ہوا ہے
عجب ہے بے یقینی
کسی کی کوئی کچھ سنتا نہیں ہے
چمکتی آنکھ ، ہلتے لب ، اشاروں والے لاکھوں ہاتھ
خود سے جو سمجھتے ہیں
ایک بے چینی کا عالم ہے
مگر موسم کے کانوں پہ اثر کچھ بھی نہیں ہے
کہ اس کی آنکھوں پہ سورنگوں والا ایک چشمہ ہے
جہاں بے اعتباری ، بے حسی اور بے رُخی کی سب شعاعیں
اس کے چہرے پر مسلسل ناچتی ہیں ۔
شعاعیں شش جہت میں پھیلتی ہی جارہی ہیں ۔ (نیا موسم)

اس مجموعہ میں "سرگزشتِ لمحۂ موجود" ۲۴ بندوں پر مشتمل ایک ایسی طویل نظم ہے جس میں بلند حوصلگی بھی ہے اور وفاداری کا پختہ عزم بھی ، ماضی کے اتحاد کا ذکر بھی ہے اور حال کی بے انصافیوں کا گلہ بھی ۔ بدلتے ہوئے حالات اور ماحول کی بھرپور

عکاسی بھی ہے اور دعوت اتحاد بھی۔ نظم اس قدر اثر انگیز اور دل آویز ہے کہ قاری داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نظم کے چند بند نذر قارئین ہیں ؂

ہماری آرزوؤں میں اگر اک عزم زندہ ہے
شکستہ، ٹوٹا پھوٹا سا مگر اک عزم زندہ ہے
ابھی قدموں کو ہے شوق سفر، اک عزم زندہ ہے
ابھی سورج چمکتا ہے، ابھی سورج چمکتا ہے

ہمارے عکس پا کر فاصلوں کی جھیل روشن ہے
یہیں پہ ہے کہیں منزل، وہ سنگ میل روشن ہے
ابھی تو تیرے میرے خوابوں کی قندیل روشن ہے
ابھی سورج چمکتا ہے، ابھی سورج چمکتا ہے

مرے ہمدم! تجھے میری طرح فکر جہاں کیوں ہو؟
کسی کا گھر جلے، تیرے کلیجے میں دھواں کیوں ہو؟
تری میری سفیدی پہ اندھیرا مہرباں کیوں ہو؟
ابھی سورج چمکتا ہے، ابھی سورج چمکتا ہے

زباں جامد نہ ہو جائے کہیں، الفاظ لے کر آ
کسی پیکر میں ڈھل کے آ مگر آواز لے کر آ
مرے ہمدم ذرا پھر سے وہی انداز لے کر آ
ابھی سورج چمکتا ہے، ابھی سورج چمکتا ہے

مختصر نظموں میں بھی شاہد جمیل نے جس اختصار اور جامعیت کے ساتھ حقیقت کو شعری جامہ پہنایا ہے وہ ایک قادر الکلام اور پختہ کار شاعر سے ہی ممکن ہے۔ ان نظموں کے ذریعہ شاہد جمیل کا فنی شعور اُجاگر ہو کر سامنے آیا ہے۔ بطور مثال دو مختصر نظمیں ملاحظہ ہوں ؂

(۱) میرا بچپن:
ایک کھلونا
میری جوانی:
چاندی سونا
میری عمر کا آخری لمحہ:
کیا مٹی کیا سونا۔! (میری حقیقت)

(۲) پانیوں کے سینے میں سورج کا خواب!
پتھروں کے بس میں شیشے کا شباب!!
زندگی بے کار کی اک بحث ہے
اضطراب و اضطراب و اضطراب!!!
(زندگی: ایک بے کار بحث)

شاہد جمیل کی ایک بڑی خوبی جو بہت واضح طور پر سامنے آتی ہے وہ ہے اُن کے کلام میں تہذیبی شائستگی کی موجودگی جو انھیں جدید شاعروں میں ممتاز بناتی ہے۔ مجموعے میں خالص عشقیہ نظمیں بھی ہیں جن میں پاکیزگی اور شائستگی کا پورا پورا خیال رکھا گیا ہے اس کا اندازہ ایک خالص عشقیہ نظم "تم خواب سہی" کے مطالعے سے بآسانی لگا سکتے ہیں ؂

دیدار کا موسم ہے
کھوئے ہو کہاں جاناں!

پیڑوں پہ چہکتے ہیں
یادوں کے حسیں پنچھی
ہر دھوپ سنہری ہے
پر جوت ابھی کم ہے

میں چاند سے کیوں پوچھوں
کیا رات سہانی ہے؟
تم خود ہی سمجھ لینا!
شبنم کی سحر نم ہے

تم خواب سہی لیکن
خط میرا حقیقت ہے
تھک ہار کے لوٹا ہے
اور اس کا مجھے غم ہے

دیدار کا موسم ہے
کھوئے ہو کہاں جاناں!

شاہد جمیل نے اپنی نظموں میں موجودہ عہد کے سنگین حقائق اور تلخ سچائیوں کو عصری آگہی اور برجستگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بعض نظمیں تو احساسات اور تاثرات کی منہ بولتی تصویر معلوم ہوتی ہیں۔ جن میں سچّے مشاہدات اور تلخ تجربات کی ترجمانی بھی ملتی ہے اور زبان و بیان کا بے ساختہ، برجستہ اور خوبصورت استعمال بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ اسلوب ان کی نظموں کی جان ہے۔

نظموں کی طرح شاہد جمیل کی غزلیں بھی فنی اور عصری تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں اور بلاشبہ زندگی کی بھرپور عکاسی کرتی نظر آتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں بھی عصر حاضر کے مسائل کا ذکر موجود ہے۔ نظموں کی طرح ان کی غزلیں بھی معیاری ہیں۔ نئی نئی ترکیبوں اور نئے نئے قافیہ و ردیف کے استعمال کے باوجود غزلوں کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ غزلوں کے بیشتر اشعار اپنی اثر انگیزی کی وجہ سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

پلکوں پہ نیند ہوگی، نہ آنکھوں میں کوئی خواب
موسم کبھی کبھار کچھ ایسے بھی آئیں گے

خوشی کے نام پر تمام عمر یوں گزر گئی
نئے نئے غموں کے انتخاب میں مگن رہے

سفر تمام ہو چکا ہے، اب اُسے نہ ڈھونڈیے
غبارِ راہ بن کے بے سبب اُسے نہ ڈھونڈیے

وہ بجھتے چراغوں کا عَلَم لے کے چلا تھا
سنتے ہیں، اُجالوں نے اُسے لوٹ لیا ہے

دھوپ اکتائی ہوئی پھرتی ہے سڑکوں سڑکوں
میرا کمرہ ہے کہ برسوں سے سویرا مانگے

ملنے والے کو جھٹک دینا تو ممکن ہے جمیلؔ
جو نہ ہاتھ آئے اُسے کون بھلا سکتا ہے

شاہد جمیل کی غزلوں میں جہاں عصر حاضر کے مسائل اور ذاتی رنج والم کا ذکر ہے وہیں بدلتے ہوئے حالات اور موجودہ ماحول کی بھرپور عکاسی بھی ہے۔ شاہد نے اپنی حساس نگاہوں سے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا ہے اُسے بڑی ایمانداری اور حق گوئی سے قرطاس و قلم کے حوالے کر دیا ہے۔ چند اشعار بطور خاص ملاحظہ ہوں ؎

کہیں بھی کوئی شیشہ آشنا نہیں
یہ پتھروں کا شہر ہے! کمال ہے!

جہاں اپنی تھوڑی سی پہچان تھی
اُسی شہر سے ہم نکالے گئے!

دھواں، غبار، لہو، پیاس کچھ تو لیتے جاؤ
ہمارے شہر سے لوٹو گے اور خالی ہاتھ؟

شاہد جمیل کی چند غزلیں ایسی بھی ہیں جن میں کچھ نئے تجربے در آئے ہیں۔ مثلاً مختلف مہینوں یا مختلف رنگوں کا قصداً، برمحل اور برجستہ استعمال۔ نظیر اکبر آبادی کے یہاں گرچہ چند ہندی مہینوں، ہندوستانی موسموں اور تیوہاروں کا ذکر ملتا ہے، لیکن نظم کے پیرایہ میں، غزل کے پیرایہ میں شاید شاہد جمیل سے قبل اس طرح کا کوئی تجربہ نہیں کیا گیا ہے۔ شاہد جمیل نے انگریزی مہینوں کے نام کو مع خصوصیت بڑی خوبصورتی سے اپنی غزلوں میں جگہ دی ہے۔ اسی طرح سُرخ،

سبز، زرد، سنہرے، گلابی، نیلگوں، سرمئی، سفید اور سیاہ رنگوں کو غزل کی ردیف بناکر ایک دلچسپ اور حسین تجربہ کیا ہے۔ بعض مہینوں کی بعض تاریخوں کو تو تاریخی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ مثلاً "نومبر" ردیف میں جو غزل کہی گئی ہے اس میں بھاگلپور کے اس خونیں فساد کا ذکر اشارہ وکنایہ میں آگیا ہے، جو نومبر ۱۹۸۹ء میں رونما ہوا تھا۔ ملاحظہ ہو وہ غزل ؎

دھواں ہے نہ شعلہ نومبر — مرے دل سے اچھا نومبر
سجیلا، سنہرا، اکہرا — اسی کا سراپا نومبر
اُسے گرم کپڑوں میں بھر کے — سمجھتا ہے کیا کیا نومبر
سنہری سبک سردیاں ہیں — کسی یاد جیسا نومبر
مگر وہ لہو رنگ بارش! — کہ جس میں نہایا نومبر

مختلف رنگوں کو شاہد جمیل نے جس حُسن سے شاعرانہ رنگ دیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ بطور مثال "سیاہ" ردیف میں یہ غزل ملاحظہ ہو ؎

سیاہ غم، دل سیاہ — لہو کی منزل سیاہ
سفید تو، میں سفید — تمہارے مرے دل سیاہ
بھنور میں قوس قزح — ہر ایک ساحل سیاہ
جنوں کے صحرا میں نور — خرد کی محفل سیاہ
تمام سجدوں میں دھند — دعا کا حاصل سیاہ

شاہد جمیل کی کچھ نظمیں اور غزلیں ایسی بھی ہیں جنھیں انھوں نے اپنے ۲۶ سالہ جوان بھائی کے اچانک انتقال سے متاثر ہوکر لکھا ہے۔ ان نظموں اور غزلوں میں انھوں نے اپنے ذاتی درد وکرب کو جس دل دوز انداز میں بیان کیا ہے، قاری اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ شاہد جمیل کا درد وکرب ایک طرف عام انسان کا درد وکرب معلوم ہونے لگتا ہے تو دوسری جانب ان نظموں اور غزلوں میں شاہد جمیل کا فن بلندی پر نظر آتا ہے اور شاہد جمیل اپنے ہم عصروں میں منفرد نظر آتے ہیں۔ اُن غزلوں اور نظموں کے رنگ وآہنگ شاہد جمیل کی تخلیقی صلاحیت کا اعتراف کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اپنے عزیز بھائی ساجد شاہین کی اچانک موت کا ذکر شاہد نے جس دل دوز انداز میں کیا ہے وہ قابل مطالعہ ہے۔ ایسی غزلوں سے چند اشعار دیکھیں ؎

ہنستا گاتا رستہ دھند میں کھو جاتا ہے
کتنی آسانی سے یہ بھی ہو جاتا ہے

تو چاند میرا، جھیل کی تہہ میں اتر گیا
میں ساحلوں کی دھند میں ڈھونڈا کروں تجھے

مرے لہو کے پرندے! اڑان ایسی بھی کیا
مرے رگوں میں تری وادیاں دھواں لا رب

تو جا کے چھپ گیا یوں بادلوں کے پار کہیں
کہ ہر اصول کھنڈر اور ہر قسم آسیب

خزاں نہیں تھی مگر گل چمن کو چھوڑ گیا
پھر اس کے بعد بہار اتنی معتبر نہ ہوئی

اس سلسلے کی نظموں میں "ایسی بھی کیا آنکھ مچولی"، "تو نہیں جانتا"، "کیا عجب ہے"، "ایک گونگا سوال"، "قبر سے صبر تک کا سفر" اور "ایک بے آواز مکالمہ" شاہد جمیل کی ایسی نظمیں ہیں جن میں قاری اپنی آپ بیتی کے نقوش پاتا ہے اور اس کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں ؎

اتنی چیخیں، اتنی پکاریں، اتنی آہیں
———— اور خدا!
عین بہاروں کے موسم میں گل وہ سپرد خاک ہوا

اے رب کریم!
خزاں کی ایسے وقت ضرورت چمن کو کب تھی۔
یا تجھ کو معمول سے ہٹ کر کچھ کرنے کی مہلت کب تھی!!؟
(ایک گونگا سوال)

شاہد جمیل اردو شاعری میں ایک نئی اور منفرد آواز کا نام ہے۔ ان کے کلام میں طرزِ احساس اور طرزِ اظہار کی جدت و ندرت قدم قدم پر نظر آتی ہے۔ وہ زبان کا تخلیقی استعمال کرتے ہیں اور لفظوں کو اس طرح نئے سیاق و سباق میں لاتے ہیں کہ ان میں مفاہیم کی نئی جہتیں پیدا ہوتی ہیں اور معانی کے ان دیکھے آفاق جلوہ گر ہوتے ہیں۔ شاہد جمیل کی شاعری تمام جدتوں اور ندرتوں کے باوجود زندگی کے حقائق سے مربوط اور پیوستہ رہتی ہے۔ یہ خواب و خیال کی دنیا میں گم نہیں ہوتی بلکہ ارضی مسائل اور انسانی جذبات و احساسات سے اس کا رشتہ استوار رہتا ہے۔ ●

شاہد جمیل : مشاہیر کی نظر میں

مرتّب : سیّد احمد قادری

شمس الرحمٰن فاروقی

"آپ کا کلام عمدہ ہے۔ اس میں ایک وقار، تفکر اور ٹھہراؤ ہے جو آپ جیسے کم عمر شاعر کے لئے لائقِ افتخار ہے۔"

[ایک خط سے اقتباس]

مظہر امام

"نظم نگاری کا آپ کو خاص ملکہ ہے اور غزلوں کی بہ نسبت میں آپ کی نظمیں آج کی اردو شاعری میں نمایاں ہیں۔"

[ایک خط سے اقتباس]

گوپی چند نارنگ

"آپ کا کلام نظر سے گزرتا رہا ہے اور آپ کی تازگیٔ فکر اور تراش کا قائل ہوں۔"

[ایک خط سے]

محمود ہاشمی

"شاہد جمیل کی شاعری میں باقی کے شعر جیسا انفرادی ذائقہ ہے۔ اور شاہد جمیل جدید تر نسل کے تازہ کار رویّے کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کا مجموعہ "خوابوں کے ہم سائے" پڑھنے والوں کو چونکائے گا۔"

[کتاب کے فلیپ سے]

دیوندر اسّر

"آپ نے بغیر کلیشے کا سہارا لیے، نئی حسیت کے اظہار کا بڑا IMOTIVE AND EXPRESSIVE PATTERN دیا ہے۔"

[ایک خط سے]

بلراج کومل

"نظم و غزل دونوں اصناف میں، انتخابِ موضوعات و الفاظ، مصرعوں کی نشست و برخاست، لب و لہجے کی تازگی اور ندرت، قافیے کے فنکارانہ استعمال کی صوتیاتی سحرکاری ان کے کلام کی امتیازی خصوصیات ہیں۔"

[کتاب کے فلیپ سے]

قمر رئیس

"ان کی شعری لفظیات، پیکر تراشی اور احساسات کی دنیا میں غیر معمولی تازگی اور تنوع کا احساس ہوتا ہے۔"

["نیا سفر"، دہلی میں تبصرہ]

کمار پاشی

"اظہار و بیان پر جن چند جدید تر شعراء کو دسترس حاصل ہے،

ان میں شاہد جمیل کا نام سب سے نمایاں ہے۔"

[کتاب کے فلیپ سے]

کلام حیدری

" خوابوں کے ہم سائے " میں جا بجا ایسی چنگاریاں ملتی ہیں جو اہم روشنیاں بن سکتی ہیں۔"

[ایک مضمون سے]

ندا فاضلی

" آپ کے مجموعہ میں ایسے الفاظ کی کمی نہیں جو آپ کے اپنے جذبات و محسوسات کی گواہی دیتے ہیں۔"

[ایک خط سے]

علیم اللہ حالی

- " شاہد جمیل کی شاعری اپنے بعض حقائق کی وجہ سے امتیاز کی حامل ہے۔"
- " شاہد جمیل کی لفظیات اور ان کا لہجہ نجی جذبوں کو بھی POPULAR شاعری بنانے کا اہل ہے۔"
- " یہ بات مسلّم ہے کہ پہلے مجموعے سے ہی شاہد جمیل ہمیں چونکاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میری مثنوی گوش حقیقت نویس ہے۔ نئی آوازوں کے اس ہجوم میں ان کی آواز صاف سنی جاتی ہے، یہ معمولی بات نہیں۔"

[سہیل، گیا میں تبصرہ]

آزاد گلاٹی

" ان کی تخلیقی صلاحیتیں اس قدر فعال ہیں کہ ذات کو کائنات بنانے میں انھیں شعوری طور پر کوشش نہیں کرنا پڑتی۔"

[پرواز ادب، لدھیانہ میں تبصرہ]

بدر اورنگ آبادی

" گزشتہ چند برسوں میں جن شعرائے شعری دنیا کو چونکایا ہے، ان میں شاہد جمیل کا نام نمایاں ہے۔ نظم و غزل دونوں اصناف میں معنویت کی گہرائی، اندازِ بیان کا انوکھا رنگ، الفاظ کے صوتیاتی حسن اور موضوع کا پورا منظر نامہ یکساں طور پر نظر آتا ہے، اس لئے یہ فیصلہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ شاہد جمیل " بنیادی طور پر " غزل کا شاعر ہے یا نظم کا۔"

[زبان و ادب پٹنہ میں تبصرہ]

جینت پرمار

" شاہد جمیل کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اردو کے روایتی اور مروجہ اسالیب سے مکمل طور پر الگ ہے اور لمحاتی چمک دمک سے دور ایک نئے شعری اسلوب کا شناخت نامہ فراہم کرتا ہے۔"

[ایک خط سے]

سیفی سرونجی

" وہ سب سے الگ سب سے جدا لہجے کے شاعر ہیں، جن کی شاعری میں تہہ داری، فکر و گہرائی نمایاں ہے اور یہی بڑی اور اچھی شاعری کی مثال ہے۔ ان کے یہاں تخلیقی تجربہ اتنا گہرا ہے کہ بعض نظمیں پڑھنے سے تو یوں لگتا ہے کہ ہم کسی شاعر کو نہیں بلکہ ایک مفکر کو پڑھ رہے ہیں۔"

[ایک تبصرے کا اقتباس]

عاصم شہنواز شبلی

" وہ جدید نسل [۱۹۷۰ کے آس پاس ابھرنے والے شعراء] میں نہ صرف ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں بلکہ اپنے لہجے اور اپنی آواز کی وجہ سے پہچانے بھی جاتے ہیں۔ حیرت ناک تازگی، تیکھا احساس، جدید تخیلی مزاج، شاعرانہ حسن اور صاف سلیس زبان شاہد جمیل کی شاعری کی پہچان ہیں۔"

[انتشار، کلکتہ میں تبصرہ]

شاھد جمیل

اے میری تنہائی

اے میری تنہائی ! آ قریب آ !
میں ایک ٹوٹا ہوا ستارہ نجانے کس کی سحر میں گم ہوں
میں ایک بجھتا ہوا نظارہ نجانے کس کی نظر میں گم ہوں
میں ایک اُجڑا ہوا جزیرہ نجانے کس کی خبر میں گم ہوں
میں ایک دریا کا ایک قطرہ نجانے کس چشم تر میں گم ہوں
میں ایک زندہ کہ وحشتوں کے نجانے کیسے کھنڈر میں گم ہوں
اے میری تنہائی، آ قریب آ !
کہ میں نجانے کس آسماں کے خلا میں محصور ہو گیا ہوں
جہاں یہ تو بھی مری نہیں ہے
کہ تو قریب آ، مری خبر دے
مرے خیالوں کو بال و پر دے
کہ میرے سب خواب سوئے سوئے
کہ میری آواز کھوئی کھوئی
کہ میری الجھن تجھے پکارے
کہ ہر طرف یہ مہیب کوہ گراں کے اڑتے ہوئے نظارے
یہ کیسی روئی سی بے یقینی
مرے گناہوں کے آنسوؤں سے
خدایا رہ رہ کے بھیگتی ہے
یہ بھاری بھرکم گمان کیا ہے
یہ درد کا امتحان کیا ہے
کہ چاروں جانب مرا ہی چہرہ لگائے بیٹھے ہیں میرے دشمن
اے میری تنہائی، آ قریب آ !
تو میرے اندر چراغ جلنے سے قبل آجا
مری دعا مانگ
خدائے برتر سے میرے ہونے کا سلسلہ مانگ !
کہ تجھ سے مل کر میں چند لمحوں کو جی سکوں گا
میں : اک ستارہ
میں : اک نظارہ
میں : اک جزیرہ
میں : ایک قطرہ
میں : اک پرندہ
میں : ایک زندہ
کہ زندگی جس کی وحشتوں کے کھنڈر میں گم ہے
اے میری تنہائی ! آ قریب آ !
مری صدا تیرے گھر میں گم ہے !!

شاہد جمیل

خوابوں کے ہمسائے

ہم جیسے آوارہ لوگ !
خوابوں کے ہمسائے ہیں
خوابوں ہی کی باتیں ہیں
خوابوں کی سب گھاتیں ہیں
خواب ہی اپنے بادل ہیں
خواب ہی اپنے شہپر ہیں
خوابوں کی ہر خوشبو ہے
خوابوں کا سب جادو ہے
تم جو ایک حقیقت ہو
تم کو ہم سے کیا مطلب ؟
تم تو ایک ضرورت ہو
اس جھوٹی سچائی کی
جس کا رنگ اور سایہ ہو
جس کی حد میں ہو محدود
جس کی سب راہیں مسدود
دور کہیں نہیں جا سکتے
پاس کبھی نہیں آ سکتے
تم کو ہم سے کیا مطلب ؟

ہم جیسے آوارہ لوگ
خوابوں کے ہمسائے ہیں
خوابوں کی سچائی کو
باندھ لیا ہے آنکھوں سے
آنکھیں جب تک تکتی ہیں
راہیں جب تک چلتی ہیں
خواب سفر میں روشن ہے
روشن ہے ہر نقشِ قدم
کہیں نہیں کوئی منزل !
خواب خود اپنی منزل ہے

شاھد جمیل

کمرے سے باہر کا خوف

میرے کمرے میں ــــ
کھڑکی پر دہ ہٹا کر درندہ کوئی گھس رہا ہے
کواڑوں میں دُکی ہول سے آنکھ عفریت کی جھانک کر دیکھتی ہے
قریں ونیٹی لیٹر کے چمگادڑیں جھولتی ہیں
کتابوں کے ٹیبل سے چپٹا ہوا سانپ پھن کاڑھتا ہے۔
وہاں ہینگر سے لٹکتا ہے بچھو
پکتا ہوا چڑھ گیا کارنس پر کوئی کیکڑا ہے
وہ ٹی وی کے پیچھے سے ہوتی ہے جو سرسراہٹ کسی کاکروچ کی نہیں ہے۔
ادھر لیمپ کی اوٹ سے گھورتی چھپکلی کر رہی ہے اشارے
مسہری سے لگ کر کریہہ اور بد شکل مکڑا کھڑا ہے
لحاف اور بستر میں تکیے کے نیچے، سرکتے ہوئے کنکھجوروں کا دَل ناچتا ہے
مری آنکھ میں رینگتی ساعتوں سے لرزتی ہے دیوار
کلنڈر بھیانک خموشی میں پر پھڑ پھڑاتا ہے
کھا کر ہواؤں کے تھپیڑے زور سے چیختا ہے ــــ 'نکل جاؤ'
لیکن
مجھے یہ پتہ ہے کہ کمرے سے باہر نکل کر اگر میں گیا تو
یہ سچ ہے کہ پتھر کا ہو جاؤں گا!!

یاد بے مدار ہے

خلائے دل میں بھٹکتی ہے یاد آوارہ
کوئی مدار نہیں اس کا
گمرہی کے سوا
اپنی بے خودی کے سوا
سنہری، کاسنی، دھانی لووں کے لاکھوں چراغ
جو 'نور جال' بناتے ہیں کہکشاں کی طرح
لپٹ کے ان سے سنورتی ہے یاد
حد سے پھر گزرتی ہے یاد
کسی ستارے کو رستے میں چھوڑ دیتی ہے
کہیں یہ چاند کا آئینہ توڑ دیتی ہے
کبھی اُجالوں میں کچھ تیرگی ملاتی ہے
کہیں اندھیرے میں کچھ نور پھینک آتی ہے
کوئی اصول نہیں اس کا
خودسری کے سوا
خلائے دل میں بھٹکتی ہے یاد
آوارہ!

شاہد جمیل

ہمارے عہد کا المیہ

سفر شروع ہوا تھا
عجب سرور کے ساتھ
کہ ہر امنگ سے لپٹا تھا عزم نو کا غرور
تمام ہمتیں جوش و خروش میں مستور
تمام حوصلے وعدوں کی دید سے مخمور
ہر ایک وعدے کے سر پہ سجا یقیں کا تاج
ہر اک یقیں میں جڑے سچ کی آنکھوں کے ہیرے
ہر ایک ہیرے میں روشن اُمید امید سے خواب
ہر ایک خواب میں ہنستا ہوا وہی چہرہ
وہ ایک چہرہ
وہ اک داستاں، وہ ایک دعا
وہ سب دکھوں کی دوا، مہربان دستِ شفا
سفر کا سارا نشہ: بس وہ ایک دستِ شفا
کہ وہ طلسمِ سراپا تھا اور ہم مسحور
ہمیں خبر ہی کہاں آنکھ دیکھتی کیا تھی
ہمیں پتہ بھی نہیں دھڑکنوں کو غم کیا تھا
سو ہم کو علم بھی کیا، کب ہمارا دست شفا
ہمارے سینے میں چپکے سے ہو گیا داخل
ہمارے خواب ٹٹولے بڑے سکون کے ساتھ
ہماری آنکھوں سے 'رنگاب' لے گیا ہنس کر
کہ ہم یہ کیسے کہیں — 'ہم تو گونگے بہرے تھے'
ہمارے چاروں طرف شورشوں کے پہرے تھے

سفر ابھی بھی ہے جاری
نشہ ابھی بھی ہے طاری
سب اس کے قول و قسم ابھی ہم میں ہیں رقصاں
ہمارا دست شفا
منتخب چراغِ وفا
اب اپنے گھر کے لئے روشنی کا دریا ہے
وہ اپنی آنکھوں کے ہیروں سے یوں جھلکتا ہے
ہمارے خوابوں کی بستی کی زرد تاریکی
اسے سجھائی نہ دے
اُس کو کچھ دکھائی نہ دے
ہمارے قیمتی جذبوں کی اس عمارت میں
وہ چند برسوں کی خاطر ہوا ہے یوں محفوظ
ہماری ساری امیدیں جو سر پٹکتی ہیں
اسے سنائی نہ دیں گی کہ اب وہ بہرا ہے
اب اس کے چاروں طرف شورشوں کا پہرا ہے

سفر یہ جاری رہے گا
کہ آنے والا کل
ہمارے ذوق کو پرکھے اور احتساب کرے
کہ یہ اُمنگ، یہ ہمّت، یہ حوصلہ، یہ لگن
ہماری سرد سرشتوں میں نسل نسل سے ہے
کہ سچ کو بھول کے ہم
خود کو پھر دکھائیں گے خواب
پھر ایک دستِ شفا ہو بہو اسی کی طرح
کہیں سے ڈھونڈ کے لائیں گے
اور سہیں گے عذاب
کہ یہ عذاب ہمیں ہر مرض سے پیارا ہے
سفر یہ ختم نہ ہوگا
سفر یہ جاری ہے
ہمارے عہد کی یہ رات کتنی بھاری ہے!!

شاہد جمیل

یاد کی دیوار

یاد اک دیوار ہے
ہر نئے موسم کی کھڑکی جس کی اینٹیں توڑ کر
سرشار ہوتی ہے
یاد کی دیوار پھر بھی جوں کی توں مضبوط رہتی ہے
یاد کی دیوار کی بنیاد میں جو سانحے مدفون ہوتے ہیں
وہ سب آسیب ہوتے ہیں
اور اس آسیب کا جذبات سے گہرا تعلق ہے
لہٰذا جیسے جیسے آپ سوچیں سلگتی ہیں
یاد کی دیوار کی اینٹیں پگھلنے کی بجائے
اس کی اونچائی ہی بڑھتی ہے
یاد کی دیوار کی اونچائی کا اندازہ کرنا کافی مشکل ہے
بسا اوقات یہ تو عمر سے بھی کافی اونچی لگنے لگتی ہے
یاد کی دیوار کے اس پار جانے کا کوئی رستہ نہیں ہے
اُس طرف کیا ہے
کسی نے آج تک دیکھا نہیں ہے

شاھد جمیل

آوارگی کی حمایت میں ایک خشک نظم

فاصلوں سے کہو ـــــ
سُرخ موسم کے رنگِ زباں کے لئے
ان کو زیبا نہیں بے شجر راستوں سے گزرنا
اور
مسافت کی لہروں پہ بڑھتے ہوئے
چند امیدوں کے قدموں کو دھندلاہٹوں میں گرفتار کرنا
ان کو زیبا نہیں ـــــ دھوپ کی پتلیوں میں لہو رنگ بھرنا
ان کو زیبا نہیں ـــــ ایک منزل نما کھوکھلے پن کو یوں بھاری بھرکم بنانا

فاصلوں کو بتا دو ـــــ
سُرخ موسم کا رنگِ زباں: ذائقوں کا کوئی بھی سماں لے کے آئے
بے شجر راستوں کا دھواں: بن کے سورج کوئی قوتوں کے کرشمے دکھائے
دھوپ کی پتلیوں میں جہاں کوئی چھاؤں نہیں جھیلتے جھیلتے تھک سی جائے
پھر بھی
شوقِ سفر کی جبلّت
اپنے قدموں میں قائم رہے گی
فاصلوں کو یہ مژدہ سنا دو ـــــ
حیثیت ان کی یوں بھی مسلّم رہے گی

دھوپ کی پتلیاں
بے شجر راستے
اور لہو سے بھرا سُرخ موسم
فاصلوں کو مسلّح کریں تو کریں
میرے شوقِ سفر پہ اثر ان کا کچھ بھی نہ ہوگا
فاصلے میری نظروں میں بس فاصلے ہی رہیں گے
کوئی منزل نما کھوکھلا پن
میرے قدموں سے اُلجھے نہ اُلجھے
حوصلے میرے ہنس ہنس کے شاہدؔ
ہر صعوبت سے ملتے رہیں گے
ریت میں پھول کھلتے رہیں گے

شاهد جمیل

خواب زاروں کے سائے سائے

تم
اپنی بوجھل حقیقتوں کے کہیں کسی ریگزار میں گم
مری ضرورت کے سارے شاداب موسموں کے
شباب سے دور
جانے کن فاصلوں میں محصور
آپ اپنی ہی ہم زباں ہو
تمہیں خبر کیا
میں اپنے سر سبز خواب زاروں کے سائے سائے
تمہاری جیسی ہی خود پہ مرکوز رہگزر کو گلے لگائے
تمہیں نہ چھوکر، تمہیں نہ پاکر بھی کتنا خوش ہوں
میں جانتا ہوں کہ تم کو حیرت ضرور ہوگی
تمہیں بتاؤں کہ تم کو چھونے کا ہر تجسس بھی ایک سچ ہے
پھر اس پہ پلنے کی ہر تمنا میں دوسرا سچ
اور اس طرح کے ہزاروں سچ ہیں
کہ سچ کا خوابوں سے کیا تعلق ؟
تم اک حقیقت جہاں بھی محدود ہو مجھے کیا
کہ میری آنکھوں نے خواب کر کے
تمہیں کچھ ایسے سجالیا ہے
مرا سفر میرا بوجھ اُٹھائے
تمہیں نہ چھوکر، تمہیں نہ پاکر بھی
ہر تعلق، ہر ایک منظر
ہر ایک موسم میں
صرف تم کو ہی چھو رہا ہے
تمہیں کو ہر سمت پا رہا ہے

یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے!

محبت جیسا پاکیزہ تھا
وہ جذبہ عجب تھا!
عبادت جیسا سنجیدہ تھا
وہ چہرہ غضب تھا!
وہ اک جذبہ، وہ اک چہرہ
مرے چاروں طرف پہرا
خدایا —!!
تو حقیقت ہے ترا شہکار پھر کیوں خواب ..... !!!

شاھد جمیل

اتنا سکوں کس کام کا؟

اتنا سکوں کس کام کا ؟
دل میں کوئی شعلہ نہیں
لب پہ کوئی صحرا نہیں
آنکھیں سمندر سے الگ
پلکوں پہ اک قطرہ نہیں
خوابوں میں اک تارا نہیں
منظر میں نظارہ نہیں
پیشانیاں سب بے شکن
آسانیاں سب بے غش
بے تابیاں سب پُرسکوں
سودائے سر سب بے جنوں
یہ رنگ ہے کس شام کا ؟

اتنا سکوں کس کام کا ؟
کس کام کی یہ محفلیں
کس کام سے پھر دل ملیں
سکھ میں اگر وحشت نہیں
دریا تلے پربت نہیں
راحت میں بے چینی نہ ہو
قربت میں دوری ہی نہ ہو
شاخِ گلاب وصل میں
خارِ خطِ ہجراں نہ ہو
سرشاریٔ آغازِ شوق
انجام پہ حیراں نہ ہو
ساحل تو ہو طوفاں نہ ہو
در ہو نہ آنکھوں میں کوئی
پتھر نہ ہو دل پہ کوئی
پھر شیشۂ جذبات کیا
ہاتھوں میں کوئی ہاتھ کیا
کیا رنگ ایسی شام کا
اتنا سکوں کس کام کا ؟

شاہد جمیل

خود احتسابی کی ایک شام

خدایا ـــــ !

مجھے کیا ہوا ہے ؟

ہُوا کیا ہے آخر مجھے ؟

یہ کن وحشتوں میں شب و روز جینا مرا ہو رہا ہے ؟

مرے قہقہوں میں یہ کیسی اُداسی مجھے ڈس رہی ہے ؟

مری محفلوں میں یہ کس سونے پن کی صدا چیختی ہے ؟

مرے دوستوں میں یہ کس دشمنی کی ہواؤں کے جھکّڑ مجھے کھینچ کر

منظرِ عام پر لا رہے ہیں

مرے دشمنوں میں مری کون سی بدنصیبی کا چرچا ہوا ہے ؟

اقارب مرے

جو مری دوریوں میں بھی میری قرابت کا گوشہ ڈھونڈتے تھے

وہ خاموش ہیں

دور اور دور ہوتے چلے جا رہے ہیں

خدایا مجھے کیا ہوا ہے ؟

اگر میرا چہرہ بدلنے لگا ہے

اگر میری پہچان کھونے لگی ہے

اگر میری آواز الگ ہو گئی ہے

اگر میری پرچھائیں میرے بدن سے ہی ٹکرا رہی ہے

مرے خواب زاروں کا دریا

اگر میری وحشت کی گلیوں میں رُسوائیوں کی

خزف رولتا ہے

اگر میں وہی ہوں

کہ جو میں نہیں ہوں

اگر سچ یہی ہے خدایا

تو بس اتنا کر دے

مری دُھندلی آنکھوں میں میرے لئے بھی کوئی عکس بھر دے

دُعا کے لئے جب مرے ہاتھ اُٹھیں

تو میری ہتھیلی کو آئینہ کر دے !!

شاہد جمیل

نیا سال

ہر سال نیا سال آتا ہے
ہر سال اُمیدیں بندھتی ہیں
ہر بار نیا کچھ کرنے کو
دل میں ارمان مچلتے ہیں
ہر بار کچھ ایسا لگتا ہے
اس بار یہ سپنا سچ ہوگا
اس بار کا سورج ہر ہر دن
اک نئی کرن لے آئے گا
اس بار چمن کے سب غنچے
چہکیں گے، ہنسیں گے، گائیں گے
بے خواب آنکھوں کے دامن میں
کوئی رنگ آ کے بکھر جائے گا

بے نقش ہتھیلی پر کوئی
تقدیر سی کچھ لکھ جائے گا

ہر سال نیا سال آنے پر
آشاؤں کا پنچھی اُڑتا ہے
بادل سے، ہواؤں سے مل کر
خوابوں کے محل بنتا ہے
اک خطرہ نُور کا مُسکائے
تو رات سمندر ہو جائے
اک پھول جو باہیں پھیلائے
کل باغ معطّر ہو جائے

آشاؤں کے بھولے پنچھی کو
اب کیسے کوئی سمجھائے
آتا ہے نیا ہر سال، مگر
ہر کام پرانا کرتا ہے

ہر روز نکلتا ہے سورج
پر رات تو بڑھتی جاتی ہے
ہر صبح چٹکتے ہیں غنچے
اور آنکھ برستی جاتی ہے
ویسے ہی فسادی آنکھوں ہے
گھر اب بھی جلائے جاتے ہیں
ہاں اب بھی خون کی ہولی سے
تیوہار منائے جاتے ہیں
ہر کام پُرانے سال کا ہم
ہر نئے برس میں کرتے ہیں
مرنے کو زندہ رہتے ہیں
اور زندہ رہ کر مرتے ہیں
یہ کھیل کہ جب تک جاری ہے
ہر رقص کہن لہرائے گا
ہم جس دن خود کو بدلیں گے
اس روز نیا سال آئے گا

شاهد جمیل

خالی مکان میں ایک دُعا

شاید اتنا بجھا ہوا — یا
اتنا بے خود
بے آزار
جیسے سطحِ آب پہ ٹھہرا پتّہ کوئی
ساکت ، جامد ، بے رفتار
یا خود اپنی ذات کے اندر
اتنا بے در ، بے دیوار
مجھ کو
اس ویران کھنڈر میں چکراتے آسیب سے کوئی خوف نہیں
آنگن میں امرود کے نیچے بیٹھا ، تنہا ، خالی ، چپ
منظر ، پس منظر میں گڈمڈ ہوتا میں
پیپل سے ٹکرا کے پلٹتی ، سر کو پٹکتی ، اندھا دھند یہ حملہ آور
میری پیاری دوست ہَوا ،
منہ زور ہَوا
احساس دلاتی ہے مجھ کو
میرے تن میں ، من میں جتنا سناٹا ہے
اس میں تو دس دس آکاش گزارہ کر سکتے ہیں
مالک و مولا !
آوارہ سب رنگ ہوئے میری آنکھوں کے
دکھ کی یادیں خوابوں کا رخ موڑ چکی ہیں
میں کس دل سے تن کے بھیتر دھوپ نہاروں
بادل کے ارمان سجاؤں
اور سنہری ، سبز ، گلابی ، دھانی کھڑکی
مجھ میں نہ کھول
میرے من کے اندر جتنی دھند ہے مولا !
اس کو ہی کر دے انمول !!

دُکھ میرے

پیڑوں کی اجڑی شاخوں سے
میرے دُکھ مُسکائے ہیں !
ننھی چڑیا نے انھیں شاخوں سے کچھ تنکے چُن چُن کر
اپنا خواب سجایا ہے !!

شاھد جمیل

چھوٹے بھائی ساجد کی یاد میں

ایسی بھی کیا آنکھ مچولی

آنکھ مچولی کھیل میں بھی اک حد ہوتی ہے
یہ تجھ کو معلوم نہیں کیا میرے بھائی !؟
آنگن، چھت، سب دیکھ رہا ہوں
غائب ہے تو؟
سمجھا۔ لیکن چھُپا چھُپی' میں یہ تیری جدّت
مجھے نہ بھائی
کھیل کھیل میں چھپ گیا جا کے
قبر کے اندر۔!!

تو نہیں جانتا

تیرے نام سے جو خط لکھوں
اپنے پتے پر پوسٹ کروں
میرے نام تری سب یادیں
دربن کی آنکھوں سے ٹپکیں
میرے گھر کے دن رات
بارہ مہینے کی برسات

قبر سے صبر تک کا سفر

یہ تری قبر ہے!
یا مرا صبر ہے؟
قبر سے صبر تک کا سفر: کچھ نہیں، کچھ نہیں، اک مسلسل اذیت
کا زندہ اندھیرا کھنڈر
میں تری قبر پر فاتحہ کے بہانے سے مکڑی کے جالے بنوں
(اور تو۔؟)
تو مرے صبر میں مسکراہٹ کے جگنو اڑاتا پھرے!

شاہد جمیل

○

جو بھید اصل تھا، وہ تو کبھی کھلا ہی نہیں
میں جس کا عکس ہوں وہ میرا آئینہ ہی نہیں

اُداس بیٹھا ہے آئینہ بیچنے والا !
کہ اس محل میں کوئی خود کو جانتا ہی نہیں

ہم اپنی دستکیں محفوظ رکھ کے کیا کرتے
کسی مکان میں دروازہ کوئی تھا ہی نہیں

بھٹکتی پھرتی ہیں یادوں کی کشتیاں کیا کیا
عجب ہے دل کا سمندر کہ راستہ ہی نہیں

نہ کوئی ڈور، نہ بندھن، نہ راستہ، نہ غبار
یہی کہ اس کے مرے بیچ فاصلہ ہی نہیں

○

نئی اک اور حقیقت بنانے والا ہوں
میں اس کو خواب سمجھ کر بھلانے والا ہوں

یہ میرا جھوٹ تھا، مجھ کو کھرا سمجھتا تھا
میں جس کا سچ ہوں اسے آزمانے والا ہوں

انا کی جنگ، خرد کا کھنڈر، جنوں کے چراغ
میں اس محاذ پہ سب کچھ لُٹانے والا ہوں

کسی کی یاد بھی کتنے ہجوم رکھتی ہے
اکیلا رہ کے میں سارے زمانے والا ہوں

کسی کے پاس رہوں تو کسی کی یاد آئے
میں اب کی بار یہ غم بھی اٹھانے والا ہوں

شاھد جمیل

○

دل کے آسیب کا دنیا سے گلہ ہم نے کیا
شوق سے خود کو گرفتارِ بلا ہم نے کیا

ایک ہی خواب تو موتی کی طرح آنکھ میں تھا
خاکِ دل تو ہی بتا، اس کا بھی کیا ہم نے کیا

جب دُعا دی اُسے الفاظ سب اپنے برتے
اس بھلائی میں یہ تھوڑا سا بُرا ہم نے کیا

یاد سی چیز کوئی لا کے شفق پر رکھ دی
شام کو شام سے اس طرح جدا ہم نے کیا

کاش اک غم بھی ہوا ایسا کہ کبھی جس سے کہیں
دل کی زنجیر سے جا، تجھ کو رہا ہم نے کیا

○

تمام عمر یوں کیا کہ خواب میں مگن رہے
سمندروں کا عزم تھا، سراب میں مگن رہے

حقیقتوں کے شہر کی حکایتیں کچھ اور تھیں
کمال تھا کہ ہم فقط کتاب میں مگن رہے

دھواں اٹھا کیا محل محل کے صحن و بام سے
چراغ تھے کہ شام کے شباب میں مگن رہے

خوشی کے نام پر تمام عمر یوں گزر گئی
نئے نئے غموں کے انتخاب میں مگن رہے

ہمیں تو اے جمیلؔ اپنی ذات ہی نگل گئی!
وہ اور تھے جو ساقی و شراب میں مگن رہے

شاھد جمیل

○

سخن کا درد ہے کس انکشاف سے سرشار
مرا قلم ترے غم کے طواف سے سرشار

پرندلوٹ کے آیا نہ شاخ پھر لہکی
شجر کے برگ دشتِ انحراف سے سرشار

تو اک نمود کہ بانٹے سب آندھیوں کو چراغ
یہ ایک دیدۂ بینا غلاف سے سرشار

یہ ایک خواب کہ دونوں کے خواب کی تعبیر
دل و دماغ مرے، اختلاف سے سرشار

طرب کی گردستارے لیے کھڑی ہی رہی
الم بہ شیشۂ دل انعطاف سے سرشار

بہار اب مرا ہر جام دشت کو دیدے
چمن درونِ خزاں اعتکاف سے سرشار

○

سوچتا ہوں کہ اسے کون سا منظر کہتا
ریت کا جسم تھا، کیا ہاتھ لگا کر کہتا

یوں تو قطرہ ہی سمجھتا رہا، تا عمر مگر
جان لیتا تو بہر حال سمندر کہتا

یہ تو اچھا ہی ہوا، مٹھی کھلی ہے میری
ورنہ ہر شخص مجھے اپنا مقدّر کہتا

ویسے تو دونوں ہی اکتائے ہوئے تھے لیکن
وہ روادار نہ تھا، میں اسے کیوں کر کہتا

قرب کی دھوپ سے بے زار سبھی تھے شاہدؔ
کون کس شخص کو نزدیک بلا کر کہتا

شاهد جمیل

○

زرد پتوں کے تصور سے ڈری رہتی ہے
دل کے گلشن میں کوئی سبز پری رہتی ہے

موسم درد میں ہر پیڑ بکھر جاتا ہے
ایک اُمید کی وہ شاخ ہری رہتی ہے

وقت کی دھوپ تپش لاکھ اُگا لے دل پر
ایک گوشے میں مگر تھوڑی تری رہتی ہے

دل وہ پتھر ہے جو ہر موج سہا کرتا ہے
غم وہ ندی ہے جو ہر وقت بھری رہتی ہے

فکرِ محبوب، غمِ دنیا، خیالِ مسجود
بے خودی ایسے مسائل سے بَری رہتی ہے

ٹوٹتا رہتا ہے کمرے میں اندھیرا شاہد
دھوپ دیوار کے اُس پار دھری رہتی ہے

○

اُفق پر نئے رنگ ڈالے گئے
لو ہم ڈھونڈ کر پھر نکالے گئے

ترا پھول کوئی نہ آیا، مگر
بہت ہم پہ پتھر اُچھالے گئے

وہ طوفان میں تیری ننھی سی یاد
خدا کی قسم ہم بچالے گئے

بڑے شوق سے تیرے خواب آئے تھے
مرے درد کا سلسلہ لے گئے

گھٹا، دھوپ، موسم، ہوا، چاندنی
کھلونوں پہ تا عمر ٹالے گئے

جہاں اپنی تھوڑی سی پہچان تھی
اسی شہر سے ہم نکالے گئے

سزا دینے آئے تھے شاہد، مگر
عجیب آدمی تھے، دعا لے گئے

شاھد جمیل

○

مری جبیں میں دعائیں، مری زباں سجود
مرے لئے مری وحشت کا امتحاں سجود

جہاں پتہ نہیں تیرا، وہیں جھلک تیری
خدا کے شہر میں پل بھر کو مہرباں سجود

مری شکست: شبستاں میں طے شدہ تنقید
سماعتوں میں مری زیب داستاں سجود

مری سزا کی عمارت مری خطا سے بلند
خلا میں سر کو پٹکتے لہو لہان سجود

○

ہر ایک چیخ معلّق، ہر اک صدا منسوخ
ہزار سجدوں کا حاصل، ورد دعا منسوخ

مجھے کہ تجھ میں چراغوں کو ڈھونڈنا واجب
تجھے کہ مجھ میں چمکنے کی ہر ادا منسوخ

ہزار آہٹیں صدقے، ہر انتظار نثار
مگر وہ سامعہ ایسا کہ باصرہ منسوخ

وہ دن کا خواب اُجالا، یہ شام کی تعبیر
قلم بدست قوس شب کا زائچہ منسوخ

ہزار چیختے ساحل، مگر وہ اک دریا
خدا کے دشت سے گزرا کہ ناخدا منسوخ

شاھد جمیل

○

یہ کیسا رشتہ چراغوں کا تیرگی سے تھا
کہ ہر سراغ ترا، میری گمرہی سے تھا

یہ سارے شہر میں کیسا غبار پھیلا ہے
میں ٹوٹ ٹوٹ کے بکھرا تو خامشی سے تھا

وہ ایک لمحہ جو تجھے میں لائے تھے کل لوگ
وہ ایک لمحہ بھی میری ہی زندگی سے تھا

وہ خوش نصیب تھے، اک دوسرے کے دشمن تھے
مرا مقابلہ ہر موڑ پہ مجھی سے تھا!

تمہاری دی ہوئی اکتاہٹوں کا کیا کہنا!
میں رات کھل کے بغل گیر زندگی سے تھا

مری انا سے جو شاہد ابھرنے والا تھا
ڈرا ڈرا سا میں کتنا اُس آدمی سے تھا

○

یاروں میں تیرا نام اُچھالا ہے کس طرح
دل نے غبارِ دل کا نکالا ہے کس طرح

شامل کیا لبوں میں ترے، بوسۂ رقیب
ہم نے ترے خیال کو ٹالا ہے کس طرح!

کانٹے بچھا کے پاؤں میں، خوابوں میں رکھ کے پھول
دنیا نے اپنے رنگ میں ڈھالا ہے کس طرح

ہونٹوں سے مسکراتے ہوئے غم کو کیا پتہ؟
آنکھوں نے آنسوؤں کو سنبھالا ہے کس طرح

سودائے شعر ہی کے لہو سر بلند ہے!
دیکھ آستیں کے سانپ کو پالا ہے کس طرح

شاھد جمیل

○

ہونے کو تو سب ہوتا ہے
ہم جو چاہیں کب ہوتا ہے

اس کو کھو بیٹھے تو جانا
چاہت کا مذہب ہوتا ہے

پہلے لفظوں میں معنی تھے
اب ان میں مطلب ہوتا ہے

یا تو برسوں کچھ نہیں ہوتا
یا پھر روز و شب ہوتا ہے

خط لکھ کر جو دکھ پہنچائے
کوئی خیر طلب ہوتا ہے

○

مرے رتجگوں کو ظفریاب کر دے
خدایا اسے اتنا بے خواب کر دے

وہ غنچہ بدن اب کے پتھرا گیا ہے
مرے آنسوؤں کو بھی تیزاب کر دے

اُسے اتنا خوش کر کہ لب سوکھ جائیں
اُسے اتنا غم دے کہ سیراب کر دے

اگر مضطرب ہے تو اس کو سکوں دے
اگر پُر سکوں ہے تو بے تاب کر دے

یہ مخلوق اپنے لئے مسئلہ ہے
وفا کرنے والوں کو نایاب کر دے

○

غبار آنکھوں پہ یوں ہی چھا گیا ہے
کہ تیری دید کا پل آ گیا ہے

چراغوں نے کچھ اتنی روشنی دی
سحر آئی تو دل گھبرا گیا ہے

ترے جلوؤں نے اتنی دیر کر دی
نظر کا آئینہ پتھرا گیا ہے

ترا قصّہ تو اب مشہور ہو گا
مری رسوائی سے ٹکرا گیا ہے

مری تنہائی میں اب کیا نہیں ہے
تری یادوں کا موسم آ گیا ہے

شاھد جمیل

○

تری وفا کے سہارے جو لوٹتا ہوگا
اس ایک شخص کا انداز کچھ جدا ہوگا

تمہارے کمرے میں بھولے سے بھی نہیں آتا
خبر جو ہوتی کہ اپنا ہی سامنا ہوگا

مرے قدم سے جسے روندتے ہو اندھیارو!
مری بغل میں وہی آدمی کھڑا ہوگا

گھٹن کے نام پہ کچھ قربتیں بچائے رکھو
جو آنے والا ہے موسم بہت کھلا ہوگا

سنی سنائی کسی بات پر کبھی دھیان نہ دو
کبھی تمہارا بھی شاہد یہ فیصلہ ہوگا

○

چہرہ کنول، نہ دل کوئی دریا دکھائی دے
اب کے برس تو شہر میں صحرا دکھائی دے

ہم سب بکھیرتے رہیں آدم کی دھجیاں
اور گندم اپنی آگ میں جلتا دکھائی دے

آکاش چومتے ہوئے یہ قیمتوں کے ہونٹ
یعنی ہمارا قد بہت اونچا دکھائی دے

پھر سے عمارتوں کی طرف جھانک لو ذرا
ممکن ہے اب وہیں کوئی ملبہ دکھائی دے

شاہد نکل چلو کہ یہاں خوف خود سے ہے
اس شہر میں ہر آدمی تم سا دکھائی دے

مکتبہ غوثیہ (گیا) کی فخریہ پیش کش

نمبر شمار	نام کتب	صنف	مصنف	قیمت
۱-	سارا دن دھوپ	افسانے	غیاث احمد گدی	۵۰ روپے
۲-	تھکا ہوا دن	"	الیاس احمد گدی	۴۰ روپے
۳-	دھوپ کی چادر	"	سید احمد قادری	۷۵ روپے
۴-	افکارِ نو	تنقید	سید احمد قادری	۶۰ روپے
۵-	خوابوں کے ہمسائے	شاعری	شاہد جمیل	۸۵ روپے
۶-	سوکھے جزیرے کی دعا	"	یوسف جمال	۳۵ روپے
۷-	زمین ہند	قومی شاعری	فرحت قادری	۵۰ روپے
-	گوہر عروض و بلاغت	فن شاعری	گوہر شیخ پوردی	۵۰ روپے
۹-	اِن سے ملئے	خاکے	منظفر گیلانی	۳۰ روپے
۱۰-	رنگ سنگ	افسانے	بدر اورنگ آبادی	۱۵ روپے

یہ معیاری اور نایاب کتب بھی دستیاب ہیں

نمبر شمار	نام کتب	صنف	مصنف	قیمت
۱۱-	سید احمد قادری شخصیت اور فن	شخصیات	شیریں اختر	۱۰۰ روپے
۱۲	غیاث احمد گدی شخصیت اور فن	"	سید احمد قادری	۱۰۰ روپے
۱-	اردو صحافت بہار میں	تحقیق	سید احمد قادری	۲۵۰ روپے
-	صفر	افسانے	کلام حیدری	۲۰ روپے
-	الف لام میم	"	"	۶۵ روپے
-	گولڈن جوبلی	"	"	۱۲۰ روپے
-	ارتقاء	(منتخب افسانے)	مرتب کلام حیدری	۴۵ روپے
-	مزامیر	تنقید	کلام حیدری	۱۰ روپے
۱۹-	ادب اور تصوف	"	"	۲۰ روپے
۲۰-	تفہیمات	"	"	۳۰ روپے
۲۱-	فرازدار	اداریے	"	۳۰ روپے
۲۲-	برملا	(ادبی تبصرے)	"	۱۵ روپے

نمبر شمار	نام کتب	صنف	مصنف	قیمت
۲۳-	تذکرہ شعرائے گجرات	تذکرہ	مرتب کلام حیدری	۱۵ روپے
۲۴-	مطالعہ اردو	انتخاب ادب	" "	۱۲ روپے
۲۵-	احتشام حسین نمبر	آہنگ	" "	۵۰ روپے
۲۶-	فکشن نمبر	"	" "	۲۵ روپے
۲۷-	اپنی تلاش میں	سوانح	کلیم الدین احمد	۱۲۵ روپے
۲۸-	زاویۂ نگاہ	تنقید	خلیل الرحمٰن اعظمی	۶۰ روپے
۲۹-	نئے افسانے کا سلسلۂ عمل	"	مہدی جعفر	۳۰ روپے
۳۰-	اردو کے مخفی افسانے	"	ڈاکٹر حسن آرزو	۳۵ روپے
۳۱-	بابا لوگ	افسانے	غیاث احمد گدی	۵۰ روپے
۳۲-	یہ لوگ	خاکے	ڈاکٹر محمد شفیع	۱۸ روپے
۳۳-	انتخاب کلام جمیل مظہری	شاعری	"	۱۷ روپے
۳۴-	مُردے (جیمس جوائس)		ترجمہ شاہد احمد علوی	۴۰ روپے
۳۵-	سائیکی کی تقدیر (لوسس ایولیس)		" شیخ صلاح الدین	۱۰ روپے
۳۶-	لمحوں کا سفر	شاعری	نرمدیشور پرساد	۲۰ روپے
۳۷-	نوائے راز	"	مجبور شمسی	۲۰ روپے
۳۸-	کلام حیدری بحیثیت افسانہ نگار	تنقید	ڈاکٹر اسلام عشرت	۲۰ روپے
۳۹-	معیار و سائل	"	شاہ شکیل احمد	۲۰ روپے
۴۰-	میزان	"	ڈاکٹر انعام ناظمی	۵۰ روپے
۴۱-	پرائے چہرے	افسانے	ذکیہ مشہدی	۳۰ روپے
۴۲-	دوپہر کے بعد	ڈرامے	شفیع مشہدی	۲۵ روپے

تاجرانِ کتب، کالجوں اور لائبریریوں کے لئے معقول کمیشن

آج ہی اپنے قیمتی آرڈر سے نوازیں

رابطہ

مکتبہ غوثیہ نیو کریم گنج، گیا (بہار) ۸۲۳۰۰۱

Regd. P. & T. GY. (H.0.)-04/98
R. N. I. Regd. No. 3520/73
The SOHAIL Monthly, Riverside Road, Gaya-823001
58 Years of Publication
Oct.-Dec.1998
Phone : 421573, 436584